بسم اللہ

# اعلانات صفحہ ۰۷ نگار و صفحہ ۱۸ ملاحظہ ہوں

جلد ۱۸　فہرست مضامین ماہ دسمبر ۱۹۳۰ء　شمار (۶)


| | | | |
|---|---|---|---|
| ملاحظات | ۲ | باب الاستفسار | ۷۶ |
| مشرقی ادبیات و فنون پر ایک اجمالی نظر۔ سید یامین ہاشمی | ۹ | شاعر (نظم) علی اختر۔ اختر | ۸۲ |
| ایک چتا میں دو شعلے　عبد السلام فاروقی بی اے | ۲۴ | "طرۂ گل" حافظ غازیپوری | ۸۵ |
| خواجہ آتش کے متعلق کچھ جدید تحقیق و تفتیش　سراج الحق مچھلی شہری | ۳۹ | ہارون رشید کی مجلس داستاں سرائی　امتیاز علی عرشی | ۸۸ |
| جبریہ شادی (ڈراما) نسیم رضوانی | ۴۸ | صدر بزم　امین حزیں | ۹۱ |
| چند دن پشاور میں | ۶۰ | تخیلات عدم　عدم | ۹۲ |
| سید سلیمان ندوی کی طرف سے جواب۔ محمد یوسف رشیدی | ۷۱ | بقیہ ملاحظات | ۹۳-۹۶ |

# نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۸ دسمبر ۱۹۳۰ء شمار (۶)

## ملاحظات

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں ہم ہندوستانی اکاڈمی کے "تماہی رسالہ" کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے بتا چکے ہیں کہ اُردو کی خدمت کا صحیح مفہوم کیا ہے اور وہ زبان

سادگی پہ جسکے مٹ جانیکی حسرت دلیں ہے

بعض ناحق کوش اور رمز ناشناس حضرات کی دوستی سے کس قدر خطرہ میں ہے۔ اسی کے ساتھ ہم نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ اگر کسی وقت فرصت ہوئی تو اکاڈمی کے وجود اور اُس کے برکات سے بھی بحث کیجائے گی۔ ہر چند ہم اس وعدہ کی تکمیل کے لئے ابھی تیار نہیں، لیکن چونکہ اکاڈمی کی گزشتہ سہ سالہ یا تسالہ رپورٹ (انگریزی میں) شائع ہو کر ہمارے ہاتھوں تک پہونچ گئی ہے، اس لئے ضمناً و ایجازاً ایک سرسری نگاہ اس پر بھی ڈالنا ضروری ہے۔

یہ رپورٹ اوسط تقطیع کے ۲۱ صفحات پر شائع ہوئی ہے اور اسمیں شک نہیں کہ ایک ناواقف الحال شخص اسکو دیکھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے وہ وہی ہے۔ جو اکاڈمی کے ارباب نظم و نسق دنیا کو باور کرانا چاہتے ہیں، لیکن ہم اس رپورٹ کے مرتب کرنیوالے کو زیادہ مستحق مبارکباد سمجھتے، اگر وہ اس کی ترتیب کو "خلوتیانِ راز" کے لئے بھی محل تنقید و نظر ہونے سے محفوظ رکھ سکتا۔

اس رپورٹ کا تقریباً نصف حصہ تو اس بیان پر مشتمل ہے کہ اکاڈمی کا وجود کیونکر عمل میں آیا، صوبہ کی حکومت نے کس قدر دلچسپی کا اظہار کیا، کون کون ممبر نامزد ہوئے، لائحۂ عمل کیا مرتب کیا گیا، کتنے جلسے ہوئے ان میں کیسی کیسی شاندار اور وزنی تجویزیں پیش ہوئیں، وغیرہ وغیرہ اور ظاہر ہے کہ جہانتک الفاظ و ترتیب الفاظ کا تعلق ہے یا جس حد تک اغراض مقاصد کا بیان ہو سکتا ہے، اس حصہ میں ایک جگہ بھی حذف و اضافہ یا ترمیم و اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن اس کے بعد کا حصہ جس میں واقعات و عمل، اعداد و شمار کا بیان ہے، ہمکو بعض بعض مقامات میں کچھ ایسے خلا ضرور نظر آتے ہیں جہاں نگاہ پہونچکر خود بخود رکجاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید تفصیل سے قصداً گریز کیا گیا ہے۔

میں اسوقت رپورٹ کے اُس حصہ سے بحث نہیں کرنا چاہتا جسکا تعلق تجربۂ ماضی سے ہے اور نہ اُن بعض کمیٹیوں کے اندرونی تار و پود کا ذکر کروں گا جنھوں نے بعض بالکل غیر مستحق کتابوں کو انعام دینے کے لئے حد درجہ چابکدستی سے کام لیا، بلکہ صرف یہ دیکھوں گا کہ آیندہ جو کچھ وہاں ہونیوالا ہے، اُس سے اُردو زبان یا اُردو کے اہل قلم حضرات کو کسقدر فائدہ پہونچنے کی توقع کیجاتی ہے

اکاڈمی کے ممبر ہونیکی حیثیت سے میرا تین سال کا گزشتہ تجربہ بتاتا ہے کہ محض پانسو روپیہ انعام کی توقع پر کوئی اچھی کتاب جو اکاڈمی کے شایان شان ہو، نہ کبھی مرتب کیجا سکتی ہے اور نہ حصول انعام کے لئے پیش ہو سکتی ہے۔ اس کا سبب خواہ زر انعام کی کمی ہو یا کچھ اور بہر حال یہ ایک واقعہ ہے جس سے غالباً اکاڈمی کے دیگر ممبران اور صدر و سکرٹیری کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے ہندی کے شعبہ میں یہ شکایت محسوس نہ کیجاتی ہو لیکن شعبۂ اُردو کا تو یہ ایک تجربہ ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کامیابی کی صورت اگر کوئی ہو سکتی تھی تو صرف یہ کہ اکاڈمی خود ایک شعبۂ تصنیف و تراجم قائم کرے یا ایسے لوگوں سے جو حقیقی معنے میں اس کے اہل ہیں معقول معاوضہ دیکر منتخب کتابیں ترجمہ کرائے یا خاص خاص موضوع کی تصانیف حاصل کرے۔

رپورٹ زیر بحث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز پر عمل ہو رہا ہے اور ترجمہ و تالیف کے لئے بعض حضرات کا انتخاب بھی عمل میں آیا ہے، لیکن، کس حُسن تدبیر کے ساتھ، کس اصول تقسیم کی بناء پر اور کس لطف و مصلحت کوشی کو لئے ہوئے؟ اس کا ذکر غالب عرصہ ہوا اس طرح کر گیا ہے کہ

دہد بہ مجلسیاں بادہ و بہ نوبت من
ہمی نماید و در انجمن فرو ریزد

سب سے پہلے مجھے یہ دریافت کرنا چاہئے کہ ترجمہ کے لئے صرف انگریزی زبان کی کتابوں، اور اُن میں بھی گالسوردی کے ڈرامونکو کیوں پسند کیا گیا۔ کیا اُردو یا ہندی زبان کی ترقی کی بنیاد صرف ڈراموں ہی سے استوار ہو سکتی ہے اور وہ بھی صرف انگریزی کے عہد حاضر کے ڈراموں سے۔

اگر غیر زبانوں کی ادبیات ہی سے اُردو یا ہندی کی نجات ممکن ہے اور وہ ادبیات سنسکرت و عربی میں نہیں پائے جاتے یا جو کچھ اُن سے لینا تھا وہ لیا جا چکا ہے، تو میں دریافت کرونگا کہ فرانسیسی زبان کے تمثیل نگاروں میں سے کیورے (Curel) برنسٹائن (Bernstein) اور ٹرسٹا برنارڈ (Trista Bernard) کو کیوں نظرانداز کیا گیا۔ اطالوی ڈرامہ نویسوں میں سے ڈانزیو (D'Annunzio) کی طرف کیوں توجہ مائل نہ ہوئی، کیا لطافت خیال اور نزاکت بیان کے لحاظ سے کوئی دوسری نظیر ایسی پیش کی جاسکتی ہے۔ اس طرح اگر آپ دورِ حاضر کے کچھ زمانہ قبل چلے جائیں تو کیا روسی لٹریچر میں سے پوشکن (Pushkin) کا انتخاب نہیں ہو سکتا تھا جو فن ڈرامہ نگاری میں اپنا ہمسر نہ رکھتا تھا یا اس کے بعد داستفسکی (Dostoievsky) تورگنیف (Turgeniev) ٹالسٹائی (Tolstoy) چیکف (Chekov) اور گورکی (Gorky) کو نظرانداز کر سکتے ہیں، جنہوں نے واقعہ نگاری کی دنیا میں ایک الہامی انقلاب پیدا کر دیا اور جن کے مقابل مغربی ممالک میں کوئی ملک لٹریچر میں واقعیت (Realism) پیدا کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

بہرحال میں اصولاً اس کا مخالف ہوں کہ اُردو یا ہندی میں سب سے پہلے غیر زبانوں کے ادبیات منتقل ہونے چاہئیں۔ کیونکہ کم از کم اُردو کے متعلق میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ادبیات میں وہ اس قدر فروتر نہیں ہے جیسا کہ سمجھا گیا ہے اور اگر کوئی کمی بھی ہے تو چنداں قابل لحاظ نہیں۔ کیونکہ اسوقت ضرورت اس کو علمی زبان بنانے کی ہے۔ اور جو روپیہ ڈراموں، ناولوں اور افسانوں کے ترجمہ میں بیکار صرف کیا جاتا ہے اسے زیادہ کام کی باتوں میں صرف ہونا چاہیئے۔

اس رپورٹ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گالسوردی کے چار منتخب ڈراموں میں سے تین ڈرامے اُردو ترجمہ کے لئے منشی دیا نرائن نگم کے سپرد کئے گئے ہیں اور ایک جگت موہن لال صاحب رواں کو مرحمت ہوا ہے اگر مترجموں کا یہ انتخاب صرف اس لئے نہیں ہوا کہ وہ ہندو ہیں، تو ہم حیران ہیں کہ ان دونوں حضرات میں وہ کونسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ہندوستان کی آٹھ کروڑ مسلمان آبادی میں سے کسی میں نظر نہیں آتیں۔ اگر کسی اُردو رسالہ کا اتنی مدت تک نکالتے رہنا کہ اُس کا جوبلی نمبر شائع ہو سکے، کافی اہلیت گالسوردی کے ڈراموں کو اردو میں منتقل کرنے کی پیدا کر سکتا ہے یا نظموں کا ایک دیوان شائع کر دینا بڑا استحقاق گالسوردی کے ساتھ اردو میں انصاف کرنے کا قرار دیا جا سکتا ہے تو منشی دیا نرائن نگم اور جگت موہن لال رواں سے باندازۂ جوبلی و بہ مقیاس چار دواوین زیادہ مستحق حضرات مسلمانوں میں بھی نکل سکتے تھے، اگر اونسے سعی و کاوش سے کاوش سے کام لیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور اُردو کی خدمت کے لئے کوئی ایک شخص بھی اکاڈیمی کے ارباب نظم و نسق کو مسلمانوں میں ایسا نظر نہ آیا جو گالسوردی کے ترجمہ کرنے کا اہل ہوتا۔ معلوم نہیں اس مسئلہ میں ہم کو اپنے یہاں افراد قابل کے فقدان پر ماتم کرنا چاہیئے، یا اُس ذہنیت کی داد دینا چاہیئے جو آنکھوں میں خاک جھونکنے کی حد تک بھی اپنی عصبیت کی سکون بخشی کی تدابیر سے کبھی شرم نہیں کرتی۔

یقیناً مسٹر دیا نرائن نگم ایک اُردو رسالہ کے اڈیٹر ہیں اور اگر زمانہ کے گزشتہ چند سال کے لٹریچر کو نظر انداز کردیا جائے جو فی المعنی ہندو معاشرت و تاریخ، ہندو تہذیب و سیاست ہی کی تبلیغ و خدمت میں شمار کیا جائے گا تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے ایک حد تک اُردو کی کچھ خدمت بھی انجام دی ہے، اسی طرح اس میں بھی کلام نہیں کہ منشی جگت موہن لال رواںؔ کا مجموعۂ نظم بہت پاکیزہ چیز ہے، لیکن ان حضرات کی ان خدمات کا اعتراف اس طرح بھی ہو سکتا تھا کہ اکاڈمی رسالۂ زمانہ کی مستقل امداد کر دیتی یا رواںؔ صاحب کو اُنکے دیوان پر اسی طرح انعام دیدیتی، جس طرح صفیؔ کی مثنوی اور عروجؔ کے مرثیہ کو دیا گیا ہے، لیکن یہ کیا ضرور تھا کہ ڈراموں کا ترجمہ اُن کے سپرد کر کے غریب گالسوردی اور اُردو دونوں کو کشمکش میں مبتلا کیا جاتا۔

جیسا کہ میں گزشتہ ماہ کے رسالہ میں عرض کر چکا ہوں، اُردو زبان میں مہارت تامہ یا بصیرت کاملہ ہندوؤں میں کسی طرح پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ جس طرح ایک مسلمان ہندی زبان میں کبھی اس کے ماہر ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اُردو زبان پر اُسی شخص کو پورا عبور حاصل ہو سکتا ہے جو عربی فارسی کا "قدر ضرورت" سے زیادہ مطالعہ کر چکا ہو، جس طرح ہندی کے صاحبِ نظر ہونیکے لئے سنسکرت یا ہندی بھاشا کا علم ضروری ہے۔

جب تک مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں قائم رہی ہندوؤں کو یا تو مجبوراً یا اس ذوق کے لحاظ سے جو عام طور پر اسوقت پیدا ہو گیا تھا، فارسی حاصل کرنا پڑتی تھی، کیونکہ دربار و دفتر کی وہی زبان تھی لیکن جس زمانہ میں اُردو کا رواج ہوا وہ دور حکومت برطانیہ کے آغاز کا تھا، جب اُردو سے زیادہ انگریزی جاننے والوں کی ضرورت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو جنھوں نے فارسی و عربی کا مطالعہ بقدر ضرورت محض مجبوری کی بنا پر کیا تھا۔ اب انگریزی کی طرف متوجہ ہو گئے اور کچھ عرصہ میں فارسی عربی کا تھوڑا بہت ذوق جو ان میں چلا آرہا تھا رفتہ رفتہ فنا ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس مجبوری میں مسلمانوں کو بھی شریک ہونا پڑا۔ اور اُن کو بھی انگریزی کی طرف مائل ہونا ضروری ہو گیا، لیکن وہ عربی فارسی سے نابلد نہ رہ سکتے تھے کیونکہ ان کا مذہبی، تاریخی، قومی، معاشری، اخلاقی و ادبی لٹریچر سب انھیں زبانوں میں تھا اور سب سے پہلے حروف شناسی کے بعد ہی جو کتابیں اُنکے سامنے رکھی جاتی تھیں وہ عربی فارسی کی ہوتی تھیں۔ بلکہ اس وقت تک اکثر خاندانوں میں یہی رواج چلا آتا ہے۔

اس لئے وہ شخص جس نے اُردو زبان کا کچھ بھی غائر مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے جاننے کا مدعی وہی ہو سکتا ہے جو نہ صرف عربی فارسی کا جاننے والا ہو۔ بلکہ اُس کے اندر ایک صحیح ذوق ان زبانوں کا پایا جاتا ہو اور وہ لغوی اور اصطلاحی دونوں حیثیت سے اس فرق کو سمجھ سکتا ہو جو بادنےٰ تغیر اعراب و لہجہ ایک لفظ کے مفہوم میں پیدا ہو جاتا ہے مثالاً اسی لفظ تماہی کو لے لیجئے۔ جو اصطلاح اُردو کے سلسلہ میں اکاڈمی کی سب سے پہلی اُپج ہے۔ ان لوگوں نے سہ ماہی میں سے لفظ سہ کا ترجمہ بالاختصار تِ یا تے تو کر دیا لیکن غریب یہ نہ سمجھ سکے کہ اردو زبان میں سہ ماہی اور تماہی دونوں کا مفہوم ایک دوسرے سے مختلف ہونا چاہیئے۔ اُردو میں چھ ماہی کا استعمال ہوتا ہے، لیکن صرف اُن مراسم کے لئے جو ایک

شخص کے مرنے کے بعد چھٹے مہینے ادا کئے جاتے ہیں۔ کبھی یہ لفظ اس مفہوم سے ہٹکر استعمال نہیں ہوا۔ چنانچہ غالب کا شعر ہے ؎

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی کی
میری چھ ماہی سال میں دو بار

اس لئے اگر ماہی کا استعمال ہو سکتا ہے (حالانکہ اسوقت تک کہیں نہیں دیکھا گیا) تو اسی قسم کے مفہوم میں جو چھ ماہی کا ہے۔ اور قیاس کی بناء پر وہی مفہوم اس کا متعین ہو سکتا ہے۔ بس اسی سے اندازہ کیجئے کہ محض ذرا سی ناواقفیت زبان کی وجہ سے اکاڈمی کے تماہی رسالہ" کا مفہوم کس قدر مضحک، مہمل (اور شاید "شگون بد" بھی) ہو کر رہگیا۔

یہی سبب ہے کہ آج ہندوؤں میں بہتر سے بہتر اردو نظم و نثر لکھنے والا ایسا نہیں ہے جس کی تحریروں میں زبان، محاورہ و لغت کی غلطیاں نہ پائی جائیں، چہ جائیکہ منشی دیا نرائن نگم یا جگت موہن لال صاحب کہ ان بیچاروں نے تو کبھی اپنی زباندانی یا قدرت انشاء کا دعوےٰ بھی نہیں کیا، اور نہ حقیقتاً اُن کی زندگی کا کوئی ایسا ادبی کارنامہ موجود ہے، جو انھیں کسی تاویل بعید ہی کے بعد کسی اردو ترجمہ یا تالیف کا مستحق قرار دے مجھے انتخاب کرنیوالی کمیٹی کی جسارت پر اتنی حیرت نہیں ہے، جس قدر خود ان حضرات کے "تسلیم و رضا" پر۔ اگر ان کا نام بغیر ان کی خواہش و تمنا کے اس خدمت کے لئے تجویز کیا گیا تھا تو خود اُن کو اپنی اہلیت دیکھکر اس سے انکار کر دینا چاہئے تھا، کیونکہ اردو سے عدم واقفیت کسی ناقابلیت کا اظہار تو ہے نہیں کہ اس کو گوارا نہ کیا جا سکے، اور اگر ہو تو بھی کیا ایسی ناقابلیت باعث فخر نہیں، جس میں لارڈ اروِن، وزیر ہند، بلکہ خود ملک معظم برابر کے شریک ہیں۔ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ گالسوردی کے ڈراما (Skin game) کا اردو ترجمہ جو منشی جگت موہن لال صاحب نے کیا ہے، شائع ہو گیا ہے۔ لیکن اسوقت تک غالباً ریویو کے لئے کہیں نہیں بھیجا گیا اگر کسی وقت مجھے مل گیا تو میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکوں گا۔

رپورٹ زیر بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ اکاڈمی نے حسب ذیل علوم و فنون کی تصانیف کا بھی اہتمام کیا ہے:-

(۱) فلکیات Astronomy
(۲) جغرافیہ طبعی Physical Geography
(۳) ارتقاء Evolution
(۴) برقیات Electricity
(۵) اجتماعیات Sociology
(۶) انکشافات علمیہ عصریہ Modern Scientific discoveries
(۷) حیات اجتماعیۂ حیوانیہ Social life in animals
(۸) ماکولات Food.
(۹) فلاحت البساتین Horticulture
(۱۰) اجمالیات حکمیہ Outlines of Science
(۱۱) فلاحت Agriculture

ان گیارہ علوم میں سے صرف چار (۲، ۵، ۶، ۸ و ۱۱) پر چار کتابیں اردو کے لئے تجویز ہوئی ہیں

اور سات ہندی کے لئے۔ اس تقسیم و عدم توازن کے لئے اگر کوئی سبب موجود تھا تو اس کو ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ کیا جن علوم پر اُردو کتابیں تصنیف نہیں کرائی جا رہی ہیں، وہ اُردو میں پہلے سے موجود ہیں۔ اور کیا جن علوم پر ہندی کی تصانیف پیشِ نظر ہیں۔ وہ ہندی میں پہلے نہیں پائے جاتے تھے؟

اسی کے ساتھ مصنفین کے نام کو چھپایا گیا ہے، حالانکہ ضرورت اظہار کی تھی تاکہ ان کی اہلیت کے لحاظ سے ان تصانیف کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا۔ اگر یہ اخفا اتفاقی فروگذاشت نہیں ہے، تو اردو کے ارباب علم و فضل کو مطمئن رہنا چاہیئے، کہ ان میں سے کسی کو ان علوم پر کسی تصنیف مرتب کرنیکی زحمت نہیں دیجائیگی۔

علاوہ متذکرہ بالا علوم و فنون کے اور مباحث پر بھی اکاڈیمی کے ممبران نے تصانیف مہیا کرنے کا اہتمام کیا ہے اور ان کے لئے جو فہرست مصنفین و مؤلفین کی مرتب ہوئی ہے وہ بھی اکاڈیمی کا راز ہے جس کا اظہار رپورٹ میں نہیں کیا گیا۔

حالانکہ اس کا اظہار کم از کم اس خیال سے ضروری تھا کہ لوگ اس کو ضمیر کی عدم جرأت یا اخلاقی کمزوری پر محمول نہ کریں۔

ان مباحث میں سے افراد تاریخ ہند کے سلسلہ میں (تین ہندوؤں کے مقابلہ میں) صرف ایک محمد تغلق مسلمانوں میں قابل ذکر سمجھا گیا ہے، اسی طرح لٹریچر میں چار ہندوؤں کے مقابلہ میں صرف دو (غالب و انیس) کو لیا گیا ہے۔ اور ابطال اقوام عالم میں سے صرف ہارون الرشید اور مامون الرشید کو۔ اس کے علاوہ تاریخ و فلسفہ وغیرہ میں کسی جگہ مسلمانوں کی نمائندگی کا خیال نہیں کیا گیا۔

میں حیران ہوں کہ وہ کون سے (Members of the Academy) تھے۔ اور وہ (Other Scholars) کس گوش و ہوش کے تھے، جنھوں نے نہ صرف انتخاب علوم بلکہ اُن کے ماتحت انتخاب مباحث میں اس قدر بے اصولی، پریشان خیالی، غیر موزونی اور محاورۂ عوام میں "بے تکے پن" سے کام لیا۔

سنہ ۳۰-۲۹ میں اکاڈیمی نے صرف ایک مسودہ "دیلی کرسان رکمنی ری" اشاعت کے لئے پسند کیا۔ معلوم نہیں اور مخطوطات موصول ہوئے یا نہیں، اگر ہوئے تو کتنے اور کس کس موضوع پر اور ان میں سے صرف رکمنی والے مسودہ کو پسند کرنے کے کیا اسباب تھے؟ ان تمام اُمور کی طرف سے رپورٹ کے مرتب کرنے والے نے بہت بامعنی سکوت اختیار کیا ہے۔

ہندی اُردو لٹریچر کی ترقی کی سالانہ رپورٹ اکاڈیمی کے اسکالروں نے کانفرنس میں پڑھی تھی، اسی طرح اور مضامین اس موقعہ پر پڑھے گئے تھے، لیکن وہ ابتک شائع نہیں کئے گئے، رپورٹ میں ان کی اشاعت کا سرسری وعدہ کرکے ٹالدیا گیا ہے۔

شائع شدہ کتابوں کی تعداد چودہ بتائی گئی ہے، سات کے متعلق ظاہر کیا گیا ہے کہ پریس میں ہیں، چھپا عت

کے لئے تیار ظاہر کی گئی ہیں۔ اور آٹھ نظر ثانی کی منزل سے گزری ہوئی ہیں۔ لیکن رپورٹ کے مرتب نے نہ انڈکس کی صورت میں نہ اصل رپورٹ میں کہیں ان کتابوں کی فہرست دی۔ اور نہ بعید ترین اشارہ اس امر کی طرف کیا گیا ہے کہ وہ کس زبان و موضوع کی ہیں۔

اسی طرح رپورٹ میں تکمیل کے ساتھ کسی جگہ اس کا ذکر نہیں ہے کہ لکچر دینے والوں کو کیا رقم دی گئی، انعام پانیوالے اور مترجمین کون کون تھے اور کس کو کیا دیا گیا۔ اگر رپورٹ کے تسلسل میں اس کے بیان سے خرابی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا تو انڈکس کی صورت میں اس تفصیل کو ظاہر کرنا چاہئے تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی قابل افسوس ہے کہ گزشتہ تین سال کے اندر جو جو لکچر دئے گئے ان میں سے سوائے بعض کے ابھی تک شائع بھی نہیں ہوئے۔ یا اگر شائع ہوئے تو ان پر ارباب صحافت کو رائے زنی کا موقع نہیں دیا گیا۔ لائبریری کے متعلق جو روپیہ صرف کیا گیا ہے اس کی تفصیل ہونا چاہئے کہ اردو کتابوں پر کس قدر رقم خرچ کی گئی۔ اور ہندی کتابوں پر کتنی؟ اور ۲۰۶۷ ہندی کتابوں کے مقابلہ اردو کی کتابیں کیوں صرف ۱۹۲۶ فراہم ہو سکیں۔

الغرض یہ رپورٹ اپنی ترتیب و تفصیل کے لحاظ سے بہت نامکمل ہے اور باوجود کوشش اخفاء کے بعض امور میں جو کہیں کہیں "ترشح" ہو گیا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ "ظرف" کس چیز سے لبریز تھا؟

---

میں اخیر میں ایک بار پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسوقت ہندوستان جس دور سے گزر رہا ہے اور جس کی اہمیت سے کوئی تعلیم یافتہ ہندو بے خبر نہیں، صرف رواداری چاہتا ہے، لیکن خیر رواداری تو بڑی چیز ہے، مسلمانوں کو اُن کی زندگی کے ان حقوق سے بھی محروم کیا جارہا ہے؛ جو ان کے عمران و تمدن کے اجزاء ترکیبی ہیں۔

ایک طرف ہندو حضرات سیاسیات و قومیات میں مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے رہنے کی بھی دعوت دے رہے ہیں۔ "بھارت ماتا" کے حقوق بھی دونوں جماعتوں پر یکساں ثابت کئے جاتے ہیں، لیکن جب ان جذبات وطنیت کا تجزیہ کیا جاتا ہے، جب اس دعوائے بانگ کے بعد اعمال و افعال پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مکر و فریب ہے خدع و ریا ہے، اور ہندو جماعت ابتک مسلمانوں کے وجود، مسلمانوں کی معاشرت، مسلمانوں کی تہذیب، یہانتک کہ مسلمانوں کی زبان و انشاء کو بھی "آریہ ورت" کی "پوتر" فضا میں دیکھنا پسند نہیں کرتی۔

دنیا کو معلوم ہے کہ میں کانگریس کے مقاصد و اغراض کا بہت بڑا حامی ہوں اور میں نے ہمیشہ مسلمانوں کو یہی بتایا کہ اگر ہندوستان میں رہنا ہے تو ابنائے وطن کے ساتھ وطنیت کے رشتہ کو مستحکم کرو اور مذہبیت کو بالکل علیحدہ رکھو۔ کیونکہ ایک ایسے ملک کی ترقی جس میں مذاہب کے لحاظ سے مختلف جماعتیں پائی جائیں، غرض مشترک اور مرکزیت صرف وطنیت کے جذبہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔ (بقیہ ملاحظات کیلئے صفحہ ۹۳ ملاحظہ ہو)

# مشرقی ادبیات وفنون پر ایک اجمالی نظر

**تمہید** مغربی تمدنی وادبی ترقی کے مطالعہ کے بعد اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم مشرقی ادبیات وتمدن کا بغور مطالعہ کریں، اور تقابل کے بعد یہ دیکھیں کہ ہم میں کیا خامیاں ہیں اور وہ کون سے موانع ہیں جنھوں نے ہمیں ترقی سے روک رکھا ہے اور یہ کہ وہ موانع فطری ہیں یا عارضی۔

مشرقی ذہنیت پر ہمیشہ سے قدامت پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ الزام نادرست نہیں ہے۔ اور نیا مذہب ہو یا نیا تمدن، اسکو سب الحاد وکفر ہی نظر آئے گا۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ ذہنیت مذہبی غلو کا نتیجہ ہے۔ اور سرڈینی سن راس قدامت پرستی کو مشرق کی آب وہوا پر محمول کرتے ہیں، لیکن میں اس کا بھی قائل نہیں، جب میں دیکھتا ہوں کہ اس وسیع براعظم میں ہر قسم کی آب وہوا کی "نیابت کاملہ" موجود ہے۔

ہم نے اپنی نکبت وبدبختی کا راز صرف یہ سمجھا ہے کہ ہمپر ابتدا سے مستبد سلاطین کا تسلط رہا، اسلام نے اپنی مختصر تیس سال کی زندگی میں اس استبداد کو مٹانے کی کوشش بلیغ کی، وقتی مذہبی جوش کچھ دنوں کے لئے ذہنیت پر غالب ہوتا دکھائی دیا، لیکن جب عجم سے ربط وضبط پیدا ہوا تو وہ ساری پرانی کیفیتیں پھر عود کر آئیں۔

ممکن ہے کہ آپ میرے اس نظریہ کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوں، اس لئے کہ استبداد حکومت کو ملکی ادبیات وفنون سے بظاہر کوئی تعلق محسوس نہیں ہوتا، لیکن جب آپ غور فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ابتدائی زندگی کے تمام شعبے اور اُن کی ترقی، تنزل کی ذمہ داریاں سب حکومت پر منحصر ہیں۔

قدامت پرستی، غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے، آزاد خیالی، حریت ومساوات ہی سے پیدا ہو سکتی ہے، آپ شاعری ہی کو لے لیجئے۔ جب تک اُمرا وسلاطین کی جابرانہ حکومت قائم رہی، شاعری وہرزہ گوئی میں کوئی فرق نہ تھا۔ ثنا وصفت میں جو قصائد لکھے جاتے تھے وہ شاعرانہ ذہنیت کا بدترین نمونہ تھے، بادشاہوں کی عیاشیوں نے غزل کا طرز بھی بالکل بدل دیا اور شاعری جذبات عالیہ سے معرا ہو کر رکیک جذبات کے برانگیختہ کرنے کا ذریعہ بن گئی تھی۔

ابتدائی دور اسلامی میں سلطنت ومذہب کا حقیقی افتراق ممکن نہ ہوا۔ خلافت راشدہ کے ختم ہونے کے بعد سیاسی اغراض اس امر کے متقضی تھے کہ مذہب وحکومت متحد رکھے جائیں، کیونکہ مذہبیت کا اثر سب پر حاوی ہو چکا تھا۔ اس لئے

امتداد زمانہ نے بادشاہ کو ایک مذہبی حیثیت دیدی۔ لیکن چونکہ فرمانروا خود مذہب سے اکثر ناواقف ہوتے تھے، اس لئے "علماء کرام" کو اپنا بنایا گیا تاکہ وہ اثر قائم رہے، ان "مولویوں" کو یہ موقع اچھا ہاتھ آیا، ایک طرف شاہانہ قدر و منزلت اور دوسری طرف عوام پر اقتدار، دونوں باتیں حاصل تھیں۔ اس "امتزاج" نے ایک ایسی مذہبی فضا قائم کردی کہ ہر فعل کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے گا، اور ہر وہ عمل ناجائز سمجھا گیا، جس میں ذرہ برابر بھی اسکی اہلیت تھی کہ وہ خیالات میں وسعت پیدا کرکے مذہبی غلامی سے دماغ کو آزاد کردے گا۔ قرآن کا ترجمہ ناجائز قرار پایا صرف اس لئے کہ عوام حصول علم کے بعد ان مطالب کی طرف کبھی بھی توجہ نہ کریں گے۔ جو صرف اس لئے اختراع کئے گئے تھے کہ توہم پرستی وجہالت میں مبتلا ہوکر وہ ہر مسئلہ کے سامنے سرِ اطاعت خم کریں۔

عربی و ایرانی ادبیات سے قطع نظر کرکے آپ صرف ہندوستان کو لے لیجئے۔ آٹھ سو برس کے وسیع دوران حکومت میں مسلمانوں نے جتنی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں سے نصف مذہب کے فروعی مسائل پر ہیں (جینے کم سے کم سو کتابیں۔ صرف اس مبحث پر دیکھی ہیں کہ سورہ فاتحہ میں "ضالین" کا ض، ذ، کے مخرج سے ادا کیا جائے یا محض ض کی صورت میں ادا ہو) باقی نصف میں، چالیس فیصدی شاعری پر ہیں، اور دس قصص و حکایات پر ہزار دو ہزار میں کہیں دو ایک کتاب واقعی خالص ادب و فن پر ہوتی ہے۔ اس ماحول میں ادبی ترقی جو ہو سکتی تھی، ظاہر ہے۔ جو حال ہندوستان کا تھا وہی کم و بیش ایران و عرب کا بھی تھا۔

ہندی مسلمانوں کی اس بدقسمتی میں ہندو بھی شریک رہے۔ مولویوں کی طرح پنڈتوں نے بھی "وسعت نظر" کے خلاف علم جہاد بلند کردیا۔ پیشہ کی تقسیم نے پنڈتوں کی اعانت کی اور انکا اقتدار و اثر مولویوں سے بھی زیادہ قائم رہا۔

یہ تو ادبیات کا حشر ہوا۔ اب فنون عام تمدن کو لیجئے۔ فنون لطیفہ، (مصوری، موسیقی وغیرہ) کے متعلق تو خیر ناجائز ہونیکا فتویٰ صادر ہو ہی چکا تھا، رہ گئی صنعت و حرفت سو اس کو معاشرتی اصول نے مذموم قرار دیدیا۔ حالانکہ اسلام نے کبھی بھی وہ غلامی جائز نہیں قرار دی تھی۔ جسے لوگوں نے رواج دے رکھا تھا۔ بہرنوع اس مذموم رواج نے غلاموں کو مزدور پیشہ جماعت بنادیا، غلام مزدوریاں کرتے، تجارت کرتے، پارچہ بافی کرتے، غرض تمام صنعت و حرفت جس میں محنت شاقہ کو دخل ہوتا وہ غلاموں سے لے لی جاتیں۔ غلامی اور مزدوری میں رفتہ رفتہ ایک ایسی مناسبت پیدا ہوئی کہ عام مسلم ذہنیت نے خود مزدوری محنت کو مذموم سمجھنا شروع کردیا۔ یہی وہ کج ذہنیت ہے جو مسلمانوں کی (خواہ وہ ایرانی ہو یا ہندوستانی یا عربی) موجودہ تخریب کی ذمہ دار ہے۔

اس معاملہ میں بھی ہندوؤں نے ہماری کسی حد تک "شرکت غم" کی۔ مسلمانوں کی اس غفلت سے اونھوں نے فائدہ ضرور اُٹھایا، لیکن پھر بھی اوس حد تک نہیں جس حد تک اونکو مواقع حاصل تھے۔ پیشہ کی تقسیم نے قومیت کا پہلو اختیار کرلیا اور صدیوں تک قوم کے ہونہار نوجوان اون پیشوں کے حصول سے محترز رہے، جنکا اونکو شوق تھا، یا جس میں اون کا فطری میلان اونکو کامیاب بنا سکتا تھا۔

موجودہ دور انقلاب نے البتہ مشرق میں ایک بیداری پیدا کردی ہے۔ اب ہمیں اپنی خامیاں محسوس ہو رہی ہیں اور اس لئے ممکن ہے کہ ہم اونکا ازالہ بھی بآسانی کرسکیں گے۔

مذکورہ ذیل مضمون میں نے عربی، ایرانی، ہندوستانی اور چینی ادبی و فنی حالات کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے، یوں تو ایشیا کا ہر ملک ایک خاص تمدن و تہذیب رکھتا ہے، لیکن یہ چار ممالک اپنی تاریخی روایات کی بناء پر ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اسی لئے میں نے انکا تذکرہ مناسب و ضروری سمجھا۔

## عرب

یہ مسئلہ اب مسلمات کی حد تک پہونچ گیا ہے کہ آب و ہوا اور ملکی فضا سے ایک ملک کے ذوق ادب و شوق تمدن کا پتہ چلایا جاسکتا ہے، اور وہی تمدن ملک میں قائم رہ سکتا ہے جو اُس کی فضا کے مطابق ہو، اگر بیرونی اثرات نے اپنی قوت سے ایک اجنبی تمدن کو ملک پر مسلط کرنا چاہا بھی تو اوسکو نقش بر آب سے زیادہ وقعت کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ عرب کی قدیم و موجودہ تاریخ اس دعوے کے لئے کافی ثبوت بہم پہونچا رہی ہے۔

واقعات کے اعتبار سے آپ عرب کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کرلیں۔

(۱) قبل از اسلام۔ (۲) بعد از اسلام

لیکن اصول تاریخ کے لحاظ سے عرب کی تاریخ کسی تقسیم کی متحمل نہیں۔ تاریخ سنوات اور واقعات پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ اس سے تو آپ قوم کی ذہنیت کا پتہ چلاتے ہیں۔ اگر عرب ذہنیت میں کوئی تغیر بعد از اسلام پیدا ہوا ہو تب البتہ آپ عرب کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ورنہ نہیں۔ آپ اپنے پیش نظر ملک کا حسب ذیل نقشہ رکھیں۔

" ایک وسیع صحرا۔ جابجا اونچے اونچے ٹیلے۔ کوسوں پانی کا نام نہیں، شجر کے عوض حجر، نسیم و شمیم کی جگہ سموم و تند ہوا، آبادی کا کوسوں پتہ نہیں۔ دھوپ کی وہ شدت کہ میدان قیامت کو شرم آئے اوس پر طرہ یہ کہ ہر چہار طرف بلند پہاڑیاں، کہیں کہیں نخلستان اور چشمۂ آب"

جس ملک کی فضا کا یہ عالم ہو وہاں کے باشندوں کی ذہنیت و شوق تمدن کا آپ خود اندازہ کرلیں۔ ایسی آب و ہوا صرف مذہبی ذہنیت کی ترتیب میں معین ہوسکتی تھی، چنانچہ یہی سبب ہے کہ عرب ہی تمام ادیان عالم کا منبع اور مخزن رہا۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ چین نے ترقی کی اور اوس کی تمدنی ترقی کے اثرات دنیا میں پھیلے، وہ بھی دن آئے جب ہندوستان کو عروج نصیب ہوا، اور اوس کے تمدن و تہذیب کی لہریں ایران و مصر و یونان تک پہونچیں، وہ بھی ایک دور تھا، جب مصری تمدن سے دنیا مستفیض ہو رہی تھی، لیکن عرب نے اگر کوئی شے دنیا کو دی تو وہ صرف مذہب تھا ممکن ہے کہ ایک مذہب کا دلدادہ مذہب کو حاصل حیات سمجھکر اوسی پر قناعت کرلے، لیکن مذہب ذریعہ ہے، مقصود نہیں مسلمانوں کی تباہی کی تمام تر ذمہ داری صرف اس خیال پر منحصر رہی کہ اُنھوں نے مذہبی اعتقادات و عملیات کو مقصود بالذات سمجھا،

بقول انڈری سرویر (فرانسیسی مصنف "اسلام اور مسلمانوں کی ذہنیت") "عرب تمدن، کوئی شے نہیں اسلامی تمدن بے شک ایک چیز ہے"۔ اس کا خیال صرف اس امر پر مبنی ہے کہ عرب نے قبل از اسلام یا بعد از اسلام کوئی تمدن دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا۔ ہاں جب مسلمانوں نے ایران و مصر و ہندوستان فتح کئے، محکوم اقوام کے تمدن اختیار کئے اور اُس پر اضافے کئے، اوسوقت اونھوں نے ایک ثانوی تمدن کی بناء ڈالی جو اسلامی تمدن کے نام سے موسوم ہے۔

## قبل از اسلام

تمدن اجتماعی زندگی کا نتیجہ ہے، قبل از اسلام عرب بیرونی اثرات کا آماجگاہ رہا، اور بعد از اسلام خود عربوں نے اپنے ملک سے نکل کر دنیا میں قدم رکھا، چونکہ اسلام تخیل وطینت کا شروع سے مخالف تھا، اس لئے فاتح عربوں نے مفتوحہ ممالک کے تمدن کو خود عرب میں لیجاکر رائج نہیں کیا۔

ابتدائی دور میں بھی جبکہ خود عرب دوسرے ممالک و اقوام کا رہگذار تھا، اوس نے کوئی تمدن دوسروں سے اخذ نہیں کیا، جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ عرب کی غیر زرخیز حالت نے کسی فاتح قوم کو اُس کی جانب توجہ کا موقع نہیں دیا اگر سیاسی اغراض سے جنگ ہوئی بھی تو وہ صرف جدال و قتال تک محدود رہی، نہ ملک میں کوئی مستقل تسلط رہا اور نہ کوئی تمدنی ترویج ہوئی۔ دوسرا سبب خود عربوں کی آزادانہ ذہنیت تھی، جس نے کسی حکومت کو گوارا نہ کیا، یا تو ملک تاجروں کا رہگذر رہا یا خود عربوں نے باربردارانہ تجارت اختیار کی۔ دونوں صورتوں میں کوئی بھی مستقل صورت حصول تمدن کی پیدا نہ ہوسکی۔ مکہ والوں میں تاجرانہ ذہنیت ضرور تھی۔ لیکن بوجہ کم مائیگی صرف وہ باربرداری ہی تک محدود رہی۔

قدیم تاریخ میں سوائے عرب کے کوئی ملک ایسا نہیں تھا، جسکو تجارتی رہگذر کہا جاسکے، چین، ہندوستان اور ایران ایک طرف، دوسری طرف مصر، ایشیائی کوچک، یونان و اطالیہ ان ممالک کو زمانہ قدیم میں جو تجارتی اہمیت حاصل تھی وہ ظاہر ہے۔ تمام تجارتی مال کی درآمد برآمد کا راستہ عرب تھا، مگر لطف یہ ہے کہ پھر بھی عربوں نے ان ممالک کے تمدنی اثرات سے خود کو محفوظ رکھا۔ عرب میں بیرونی اثرات کے ذرائع حسب ذیل تھے:۔

(۱) مصریوں نے سرحدی حصوں پر قبضہ کرلیا تھا اور معدنیات کی دریافت کے لئے ملک کے اکثر حصوں میں پھیل گئے تھے۔

(۲) ۲۸۰۰ سال قبل مسیح سارگن نے شمالی مصر میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی، جس میں شام کا کل حصہ شامل تھا، سارگن کے لڑکے ریموش نے کل جزیرۃ العرب پر اپنا اقتدار جمالیا۔

(۳) ۷۱۵ سال قبل از مسیح اسیریا کے بادشاہ سارگون نے عرب پر حملہ کیا اس لئے کہ بدوی قبائل تجارت میں حائل ہوتے تھے۔

(۴) ۵۵۲ سال قبل مسیح بونیدس سلطان بابل نے بھی ملک عرب فتح کیا۔

(۵) بدوی قبائل اپنی لوٹ مار کی عادت سے باز نہیں آتے تھے اور تجارت کا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا، اسلئے مجبوراً مصر و بابل و ایران وغیرہ کے سلاطین نے عربوں سے عہدنامے کئے اور وقتاً فوقتاً نذریں پیش کیں۔

(۶) باربردار بدوی عرب کے سرحدی حصہ میں جاکر آباد ہوئے، جس سے اونکو دوسری قوموں کے ساتھ ربط و ضبط کا موقع ملا۔

(۷) یہود، عیسائی اور گبر کثیر تعداد میں ملک کے مختلف حصوں میں آباد تھے، اور عیسائی مبلغین نے ملک کے تمام گوشوں میں بھیجکر اپنے مذہب کی ترویج شروع کردی تھی۔

## بعد از اسلام

میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام تخیل وطنیت کا سرے سے مخالف تھا، اس لئے فاتحین نے ہر ملوکہ ملک میں سکونت اختیار کرلی اور اپنے وطن کو بھول بیٹھے، دوسرا سبب خود مذہب اسلام کی تشاؤم پسندی تھی۔ خود قرآن نے کبھی بھی تشاؤم کی تعلیم نہیں دی، لیکن عربی ذہنیت نے اُسے اپنا کر لیا۔ تصویری و عکاسی معصیت قرار پائی۔ جاہ و حشم معاصی میں شامل ہوگئے۔ خوش پوشی، خلاف شریعت ثابت کردی گئی۔ غرض اسلام بانیٔ اسلام کے مقاصد سے مختلف ایک بدوی خزاں رسیدہ ذہنیت کا جولان گاہ بن گیا۔

چونکہ ہمارا مبحث صرف عرب ہے، اس لئے ہم مسلمانوں کے عجمی ذوق ادب سے بحث نہیں کرنا چاہتے، مگر شاید اس قدر ذکر غیر مفید بھی نہ ہو کہ خلافت فاروقیہ کے بعد شیرازۂ اسلام میں جو انتشار پیدا ہوا اوس نے عربی سطوت و جبروت کا خاتمہ کردیا۔ بنو امیہ نے سرزمین مکہ و مدینہ سے علیحدگی اختیار کی۔ بنی عباس نے بھی خاص گہوارۂ اسلام سے بے اعتنائی برتی۔ ترکوں نے اپنے دور حکومت میں اوسے محض سیادت اسلامیہ کا ذریعہ سمجھا، اور مسلمان سلاطین نے سرزمین عرب کو کبھی متمدن بنانے کی کوشش نہیں کی۔ بس جو کچھ اوس سے تعلق تھا وہ مذہبی عقیدت تھی۔ سال کے دس دن دنیائے اسلام کا کثیر گروہ زیارت و حج کے لئے جمع ہوجاتا۔ یہاں بھی وہی غلطی قائم رہی۔ ارکان حج مقصود سمجھے گئے، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد چندے اوسکی حالت مراسم و رواج سے زیادہ نہیں رہ گئی۔

بعد جنگ عظیم انگریزوں کی ریشہ دوانیوں نے قومی تحریک کا احیاء کردیا۔ لیکن پھر بھی عرب ذہنیت پر اندرجہ مذہب غالب ہے کہ ابن سعود نے اس دور میں بھی کافی قدامت پرستی کا ثبوت دیا۔

## ادبیات

فنون کا یہ حال رہا، اب ادبیات کو لیجئے، عربی زبان دنیا کی بہترین زبانوں میں سمجھی جاتی ہے۔ میرا یہ خیال کسی عصبیت کی بناء پر نہیں ہے بلکہ سرڈینی سن راس ایسے مستشرقین کا خیال بھی یہی ہے۔

قبل از اسلام کسی عربی کتاب کا پتہ نہیں ملتا۔ ادبیات محض شاعری و گفتگو تک محدود تھے۔ سبع معلقات ہی ایک ایسا مجموعہ تھا، جس سے ہم قبل از اسلام عربی ذوق ادب کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ عربوں کو اپنی زبان دانی و تقریر

ناز تھا، چنانچہ وہ ماوراے عرب کو عجم (گونگا) کے نام سے یاد کرتے تھے۔

بعثت اسلام کے بعد سب سے پہلی کتاب جس کے تدوین کی ضرورت محسوس ہوئی، وہ کلام اللہ تھا، خلفائے راشدین کا یہ احسان ہے کہ اونھوں نے اسکو جمع کر کے محفوظ کر لیا۔

عربی ادبیات، عجمی دماغ کی ممنون منت رہیں۔ الا ماشاء اللہ خود عربوں نے کبھی کوئی ادبی ذوق کا ثبوت نہیں دیا۔ آپ تمام تر مشہور عربی تصانیف کو عجمی دماغ کا نتیجہ پائیں گے۔ میرے خیال میں اس کا بھی وہی سبب ہے جو میں پہلے عرض کر چکا ہوں، یعنی سلاطین اسلام کی خاص سرزمین عرب سے بے اعتنائی۔

اگر اس ریگستان میں کوئی نخلستان ہے تو وہ صرف عربی شاعری۔ عربی شاعری دنیا کی بہترین شاعریوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ایک طرف تو عربی شاعری میں عجمی نسائیت مفقود ہے، بدوی طرز معاشرت نے عورتوں سے بھی نسائیت غائب کر دی تھی چہ جائیکہ مرد۔ تمدن کی سادگی نے خیالات میں سادگی پیدا کر دی تھی۔ اور وہ ہر شے کو فطری نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے نہ فکر معیشت تھی۔ اور نہ خیالات میں غامضانہ بلندی۔

دنیا محبت کو انسانی کمزوری سمجھتی ہے، لیکن عرب ذہنیت نے اس کو دیگر اعلے جذبات کے پہلو بہ پہلو جگہ دی آب و ہوا۔ قد و قامت نے کبھی بھی محبوبیت کو نزاکت کا مرادف نہیں سمجھا۔ عرب ذہنیت نے عقد و مناکحت کو معاہدہ و پیمان سے زیادہ کبھی وقعت نہ دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں نے عورتوں کو کبھی منجملہ "اسباب لطافت" نہیں جانا اونکے نزدیک "اسباب ضرورت" میں شامل تھی۔ اور اس تخئیل نے شاعری میں ایک گونہ خشونت ضرور پیدا کر دی۔

# ایران

ایران کی ادبی و تمدنی تاریخ تین بڑے حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

(۱) قبل از اسلام (۲) بعد از اسلام ——— ۱۹۱۴ء تک (۳) موجودہ انقلاب

## قبل از اسلام

تاریخ قدیم میں ایرانی تمدن کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ برخلاف عرب کے ایرانی ذہنیت تمدنی اثرات قبول کرنے کی بہترین صلاحیت رکھتی ہے۔ خوشگوار موسم، زرخیز زمین، قدرتی چشموں کی فراوانی، غرض فطرت نے ایران کو وہ قدرتی فوقیت دی ہے، جو ایشیا کے کسی ملک کو حاصل نہیں ہے۔ اہل یونان و اہالیان روم کے تعلقات و روابط نے مغربی حکمت و فلسفہ کو ملک میں رائج کر رکھا تھا۔ زردشت نے جس مذہب کی تبلیغ کی وہ عقل کے خواہ کتنا ہی منافی کیوں نہ ہو لیکن تہذیب و تمدن کا مانع نہ تھا اسلام کی طرح زردشتی اصول مذہب نے کبھی "ہمہ گیری" کا ارادہ نہیں کیا۔ اوس نے تو صرف تزکیہ نفس کے ذرائع بتائے اور دنیاوی معاملات کو انسانی ضروریات پر منحصر رکھا۔ اس مذہبی آزادی نے ایرانیوں کو کبھی مذہب کا غلام نہیں بننے دیا۔

عرب سرحدی ملک تھا، لیکن وہاں کیا تھا جسکو وہ حاصل کرتے، یونان و بابل کی سلطنتیں گو فاصلہ پر تھیں، لیکن جنگی و تجارتی تعلقات نے ایران کو کسب تمدن کے کافی مواقع بہم کر دئے۔ اشوک کے زمانہ میں ہندوستان سے بھی سیاسی و اقتصادی تعلقات کے قیام کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ جنگی اسلحہ بیشتر ہندوستان ہی سے بنکر جاتے۔ دارا اور بہرام کے دور سلطنت میں شاہانہ جاہ و حشم کو بیحد عروج نصیب ہوا۔ سامان تعیش کی بہم رسانی نے فنون لطیفہ کی جانب توجہ دلائی، فن موسیقی نے ترقی کی اور آلات ترنم ایجاد ہوئے۔ دارا کے دربار میں متعدد ماہران موسیقی کا مجمع رہتا۔ بہرام گور کے زمانہ میں مصوری نے خاص ترقی کی۔ ظروف پر نقش و نگار بنائے جاتے۔ تجارتی و جنگی تعلقات نے یونانی اثرات کو عمارتوں میں قبول کیا، مگر ایرانی کبھی بھی اچھے معمار ثابت نہیں ہوئے۔ شراب سازی ایرانیوں کی مخصوص تجارت تھی۔ ہندوستان اور مصر کے وسط میں ہونے کی باعث یہ تجارتی رہگذر بھی تھا۔ ایرانی سلاطین نے اکثر عرب پر تسلط و اقتدار کی خواہش کی لیکن فتوحات کے بعد بھی کبھی پُر امن تسلط قائم نہ رہ سکا۔

## بعد از اسلام

جس وقت رسول عربی نے دنیا میں قدم رکھا اوس وقت ایران میں نوشیروان عادل کی حکومت تھی۔ نوشیرواں نے اپنی تمامتر توجہ عدالتی نظم و نسق پر مبذول رکھی۔ پُر امن زندگی نے عوام میں متمدن اثرات پیدا کر دئے تھے، لیکن اوس نے کوئی خاص صورت اختیار نہیں کی تھی۔

خلیفہ دوم کے زمانہ میں ایران فتح ہوا۔ اسلام کی ترویج و تبلیغ نے سارا قدیم تمدن فنا کر دیا، مذہبی غلو نے تمام فنون لطیفہ کو خاک میں ملا دیا۔ تصویریں ضائع کر دی گئیں، منقش قالین جلا دئے گئے، زردشتی قدیم ادبیات بہ سبب اس کے کہ وہ اسلام کے منافی تھیں، نذر آتش کر دی گئیں۔ مگر یہ صورت صرف سو ڈیڑھ سو برس تک قائم رہی۔ ایرانیوں سے زیادہ دنیا میں کوئی قوم تمدن کے حصول کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ایرانی ذہنیت کا اندازہ آپ صرف ان امثلہ سے کر سکتے ہیں۔

(۱) زمانہ تو با تو نہ سازد تو با زمانہ بہ ساز،

(۲) باہمیں مردماں بہ باید ساخت،

ایرانی اپنے کو ہر نئے ماحول کے مطابق بنا لیتا ہے۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ ضرور ہوا۔ لیکن جب مسلمانوں کو اقتدار نصیب ہوا تو ایرانیوں نے بہ ظاہر اپنے کو عربوں سے زیادہ مذہب کا وفادار ثابت کیا۔ بنو امیہ کے کے زمانہ میں وہ وسیع سلطنت اسلامیہ کا ایک جزو تھا۔ مامون نے ۲۰۵ھ میں صوبۂ خراسان کی حکومت طاہر کو تفویض کی۔ طاہر آزاد خیال تھا، اوس نے رعایا کو پوری مذہبی آزادی عطا کی، ایرانیوں نے اپنے سابقہ تمدنی و ادبی روایات کے احیاء میں کوششیں شروع کر دیں۔ مدارس کا اجراء ہوا۔ مختلف ممالک سے حکماء و اہل علم طلب کئے گئے۔ نکو بار (دریائے تخت) میں ایک عظیم رصد گاہ بنائی گئی۔

فتح اسلامی کے بعد ایرانیوں نے سب سے پہلی کوشش ۸۶۴ء میں اس امر کی کہ وہ عربی اقتدار کو ملک سے ختم کردیں۔ دو سو برس کے اندر قدیم ایرانی مذہب تو ضرور فنا ہوگیا۔ لیکن ایرانی ذہنیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوسکی۔ یعقوب نے ایک نئی سلطنت کی بناء ڈالی۔ جلال الدین ملک شاہ (۱۰۷۰-۱۰۹۲) کے زمانہ سلطنت میں تمامی فنون لطیفہ کے احیاء کی کوششیں کی گئیں۔ اور ایرانی تمدن ایک بار اور زندہ کردیا گیا۔

نقاشی و مصوری نے ایک نئی صورت اختیار کی جو گو مذہب کے تابع تو نہ تھی۔ لیکن مذہب کے خلاف بھی نہیں سمجھی گئی۔ قرآن و دیگر کتب مذہبی کے اوراق پر مطلا نقش و نگار بنائے جانے لگے۔ رزمی و بزمی قصص کے واقعات کی تصویریں بھی بننی شروع ہوگئیں۔ بہرام اور اُس کی محبوبہ فتنہ کی تصویر ایک قومی حیثیت رکھتی ہے۔ قالین اور جائے نماز پر نقش و نگار بھی بنتے تھے۔ موخر الذکر پر خانۂ کعبہ یا مسجد نبوی کی تصویر ہوتی تھی۔ اور اول الذکر پر "ساقی و محبوبہ و جام" کا پُر لطف امتزاج۔ ایرانیوں کو موسیقی سے شغف تھا۔ ابتدائی اسلامی فتوحات نے اس کو بھی معصیت قرار دیدیا تھا لیکن گیارھویں و بارھویں صدی میں ایرانی دربار ماہرین موسیقی کا آماجگاہ تھا۔ میرے خیال میں اسلامی تاریخ میں یہ پہلا دور ہے جب کنیزوں کو گانا اور ناچنا سکھایا گیا۔ بڑھتے بڑھتے یہ رواج عام ہوگیا اور شرفاء کی عورتیں بھی موسیقی سیکھتیں اور اپنے شوہروں کو اس سے مسرور کرتیں۔

بغداد و خراسان و شیراز کا یہ عام رواج تھا کہ چار بجے شام کو جب مرد اپنے اپنے کاموں سے گھر کو واپس آتے تو ان کی عورتیں نہا دھو کر اچھے اچھے کپڑے زیب تن کئے ہوئے ان کا خیر مقدم کرتیں۔ بعد غسل و طعام ملکۂ خانہ سامان سرود لیکر بیٹھ جاتی اور اپنے شوہر کے دل کو خوش کرتی۔ گیارھویں صدی میں اس طرز معاشرت نے اس درجہ رواج حاصل کیا کہ ایک سیاح نے لکھا ہے کہ جب وہ بغداد کی گلیوں میں گزر رہا تھا۔ تو اس نے صدہا مکانوں سے رقص و سرود کی روح افزا آوازیں سنیں۔ اس رواج نے زنان بازاری کو بالکل مفقود کردیا تھا۔ مرد خواہ کتنا ہی بد طینت کیوں نہ ہو۔ کبھی بھی وہ بیرونی دلچسپیوں کو پسند نہیں کرتا، جبتک کہ وہ دلچسپیاں اسکے گھر میں خود مفقود نہ ہوں۔

## زبان

شیرینی میں کوئی زبان، فارسی کا مقابلہ نہیں کرسکتی، خود زبان میں ایک شاعرانہ موسیقی ہے، ترکیب اضافت نے اختصار کی وہ لطافت پیدا کردی ہے، جس کی مثال کسی زبان میں بھی نہیں ملسکتی۔

اسلامی فتوحات سے قبل ایرانی زبان ایک گونہ خالص تھی، غیر زبان کے صرف وہی الفاظ مستعمل تھے۔ جس کا مرادف ملکی زبان میں موجود نہ تھا۔ زبان میں گو سادگی تھی لیکن لطافت سے معرا نہ تھی۔ زردشتی لٹریچر ملک میں رائج تھا اور قرآن کی طرح وہی زبان کے اعتبار سے مستند بھی سمجھا جاتا تھا۔

میں عرض کرچکا ہوں کہ ایرانی ذہنیت میں قبول اثر کا مادہ بعید ہے۔ عربی فتوحات کے بعد زبان میں غیر معمولی تبدیلی پیدا ہوئی۔ قدیم ایرانی زبان تقریبًا مفقود ہوگئی، کسی زبان میں بھی آپ کو غیر زبان کے اس قدر الفاظ نہ ملیں گے۔

جس قدر آپ فارسی میں عربی کے الفاظ پائیں گے۔

مغربی اقوام کے تعلقات نے ایک دوسری کروٹ بدلی، اوسوقت آپ فارسی زبان میں دس فی صدی الفاظ انگریزی، روسی اور فرانسیسی پائیں گے۔

## شاعری و ادبیات

ایرانیوں نے شاعری عربوں سے سیکھی، چنانچہ فارسی عروض عربی عروض ہے، قواعد کی سہولت، زبان کی شیرینی، علم عروض کی آسانی، ایرانیوں کی لطیف ذہنیت، ملک کی خوشگوار فضا، اتنے اسباب فارسی شاعری کو پُرلطف بنانے کے لئے کم نہ تھے۔ حکمت و فلسفہ و تاریخ میں فارسی تصانیف کم نہیں ہیں، لیکن شاید یہ میرا بیان غلط نہ ہو کہ فارسی ادبیات میں شاعرانہ کلام کا جزو نسبتاً زائد ہے۔

قرآنی تعلیم سے بے اعتنائی نے مسلمانوں میں تصوف کا عام مذاق پیدا کر دیا، لیکن عربی "واقعہ پسند" ذہنیت نے اسکو کچھ اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ ایرانی فضا تصوف کی پرورش کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوئی، چنانچہ آپ کو فارسی سے زیادہ کسی اسلامی زبان میں اسقدر صوفیانہ لٹریچر دستیاب نہ ہوگا۔ جلال الدین رومی کی مثنوی نے دنیا میں جو قعت حاصل کی ہے وہ محتاج ثبوت نہیں، صوفی شعراء میں حافظ کا نام اگر نہ لیا جائے تو ظلم ہوگا۔ حافظ نے نئے اُصول شاعری کی بنیاد ڈالی۔ جس کا اتباع آجتک قائم ہے۔

## دورِ جدید

ایران کا دورِ جدید نہایت امید افزا ہے، صنعت و فنون کی جانب ملک کو خاص توجہ ہے اس دور کی خصوصیت مغربی اتباع ہے، لیکن تقلید نہیں، رضا شاہ کی ذی ہوش آنکھیں ایشیائی ذہنیت کا اچھی طرح مطالعہ کر چکی ہیں۔ امان اللہ کے تلخ تجربات نے یہ ثابت کر دیا کہ ایشیا ابھی مذہبی روایات قدیمہ کا جوا اپنی گردنوں سے علیحدہ کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔

ادبیات نے بھی طبائع کے ساتھ رنگ بدلا۔ اب نہ وہ حافظ کا رنگ ہے اور نہ قاآنی و خاقانی کا طرز، مغربی اثرات نے شاعری سے مصنوعی لطافت کو فنا کر دیا۔ قصیدوں کی جگہ قومی نظمیں ہیں، غزلیات کی جگہ اخلاقی و جذبات افزا قطعات ہیں۔

## ہندوستان

ہندوستانی ادبیات و فنون کی تشریح مشکل امر ہے، اس لئے کہ انکی ترتیب و تدوین میں صرف ہندو مذہب اور ہندو قوم ہی کی کارفرمائی نہ تھی۔ بلکہ بودھ اور اسلام نے بھی اپنا کافی اثر ڈالا، بودھ مذہب کا ماخذ چونکہ ہندو مذہب ہے، اس لئے اُن کی ذہنیت میں بھی کوئی امتیاز و تفاوت پیدا نہ ہو سکا۔ باقی رہا اسلام اور مسلمان سو اسکا دخل ہندوستانی تاریخ میں اس قدر تاخیر کے ساتھ ہوا کہ اصل ہندو ذوق ادب بالکل غیر متاثر رہا۔ یہاں تک کہ آپ ہندوؤں کی ادبیات و فنون کی تاریخ اس طرح بھی ترتیب دے سکتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کا نام بھی اس سلسلہ میں نہ آئے۔ مذہب کی متضاد مخالفت نے ذہنیت کو اسدرجہ علیحدہ رکھا ہے کہ دونوں میں ایک بین فرق نظر آتا ہے، گو موجودہ مضمون

کو میں صرف ہندوؤں کی ادبی و فنی تاریخ پر محدود کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اسلامی اثرات کو نظر انداز کرنا کسی قدر نامناسب و ناموزوں ہے۔

سندھ و شمالی و مشرقی حصۂ ہند میں جو کھنڈر دستیاب ہوئے ہیں، اون سے ہندوستان کی تین ہزار برس قبل مسیح کی تاریخ و تمدن کا صحیح پتہ چلتا ہے۔ یہ امر تو پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ سکندر اعظم کی فتوحات سے قبل بھی ہندوستان اور مصر و بابل کے درمیان تمدنی و معاشرتی تعلقات قائم تھے۔ سکندر کی فتوحات سے قبل کی عمارتیں، مندر اور عبادت گاہ یونانی و مصری اُصول تعمیر کا پتہ دیتی ہیں۔ پہاڑیوں پر ایسے مندر بھی موجود ہیں، جو ایک مسلّم پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ اور تمامی نقوش، در و دیوار اوسی سے تراش کر بنائے گئے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ خود اون پہاڑیوں پر وہ پتھر نایاب ہے، اتنے بڑے اور جسیم پتھر کا وہاں پہونچانا عجیب حیرتناک واقعہ ہے۔

ہندوستان کی موسمی تبدیلیاں۔ آب و ہوا۔ برسات کا پُر لطف موسم، غرض ان مجموعی اثرات نے ہندوستانی ذہنیت کو فلسفیانہ بنا دیا۔ دنیا کی کسی قوم میں اسدرجہ غامض فلسفہ ملنا مشکل ہے، اس لئے کہ دوسرے ملکوں میں یہ ذہنیت کسبی ہوتی ہے۔ لیکن قطرت نے یہاں وہبی بنا دی ہے، مگر یہ امر تعجب خیز ہے کہ اس فلسفہ میں تشاؤم کا عنصر غالب ہے۔ رامائن و وید تفاول سے مالامال ہیں۔ لیکن ہندو فلسفہ میں تشاؤم ہے، ماہرین فن نے اس ذہنیت کے جو وجوہ بیان کئے ہیں۔ میں اون سے متفق نہیں ہوں۔ میرے خیال میں تناسخ کا اعتقاد اس تشاؤم کا ذمہ دار ہے، مرنا اور جینا، پھر مرنا اور پھر جینا اس خیال و اعتقاد نے زندگی کے مطمح نظر کو گو غامض بنا دیا۔ لیکن علویت غائب ہوگی۔ اور یہ علویت ہی ہے جو تفاول پیدا کرتی ہے۔ اس لئے کہ زندگی کی کم مائیگی تو ہمیشہ مجبور کرتی ہے کہ ہم دنیا اور اوسکے تمام شعبہ جات کو حقیر سمجھیں۔

ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ جب ہم خالص ادبیات کو مسرت انگیز پاتے ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم اس طرح کا نسائی فلسفہ پیش نہیں کر سکتی۔ ایک ہندو عورت عجیب غریب شے ہے۔ مرد کے نقطۂ نظر سے وہ محبت کا مجسمہ ہے۔ فرمانبرداری اور اطاعت کا ہیولےٰ ہے۔ وحدت مناکحت نے گو محبت کو معین بنا دیا ہے، لیکن یہ جبر ایک پُر لطف چیز ہے، رام جی اور سیتا جی کا واقعہ جو بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہو لیکن رامائن نے اُس کو جس طرح پیش کیا ہے، اوس سے عجیب و غریب پُر لطف نکات حل ہوتے ہیں۔ میری رائے میں یہ کتاب ہندو فلسفۂ نسائیت کی بہترین تشریح پیش کرتی ہے، رام جی جرات و ایثار کا مجسمہ ہیں سیتا جی عفت و راستی کا ایک پیکر ہیں، راون ظلم و بدی کا ایک نمونہ ہے۔ ہرچند والمیک نے رام جی اور راون کو اخلاقی تقابل سے ایک ممتاز حیثیت دی ہے، اور سیتا جی کے مقابلہ میں کوئی کیرکٹر پیش نہیں کیا ہے، مگر میری نظروں میں یہ قصہ سیتا جی کو ممتاز ترین جگہ دیتا ہے۔

رامائن سے کوئی موزوں اقتباس پیش کرنا مشکل ہے۔ اس لئے میں بھگوت گیتا سے چند سطریں ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ ہندو فلسفہ کا بہترین اندازہ کر سکتے ہیں۔

"انسان کے تسلسل خیالات سے اُلفت پیدا ہوتی ہے، اُلفت سے محبت اور محبت سے غصہ، غصہ کا نتیجہ پریشانی اور پریشانی کا انجام انتشار خیال۔ جہاں خیالات منتشر ہوئے، عقل میں فتور آیا اور جب عقل جاتی رہی تو انسان ایک گم کردہ راہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

لیکن جس نے اپنے خیالات سلیم کا سلسلہ قائم رکھا اور جو غصہ و نفرت سے محترز رہا اور نفس پر قابو رکھا وہ بہت جلد روشن دماغ ہو جائے گا۔ جس شخص نے اپنی نفسانیت کو پس پشت ڈال کر زندگی بسر کی اوس کو اطمینان میسر ہوا۔"

قصص و حکایات ہندوستانی ادب کی دوسری نمایاں خصوصیت ہے، کلیلہ و دمنہ دنیائے قصص میں آپ اپنی نظیر ہے۔ اس کتاب کا فارسی و عربی میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے، گو حیوانات اس قصہ میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ان سے نہایت نتیجہ خیز سبق ملتا ہے، اُصول جہانبانی معاشری قواعد، تمدنی ضوابط غرض یہ کتاب ہندو اصول سیاست کی بہترین توضیح ہے۔

طب میں ہندوؤں نے کافی دسترس حاصل کی۔ کشتہ ہندو حکماء کی ایجاد ہے، چونکہ تمدن و تہذیب کے ابتدائی مدارج تھے، اس لئے طریقہ علاج بھی معمولی تھا۔ علاوہ کشتہ جات کے جڑی بوٹیوں سے علاج ہوتا تھا۔ ہندو حکماء نے ایسی جڑی بوٹیاں دریافت کی تھیں۔ جن کو آج یورپ بھی اپنی کیمیاوی ترکیب سے دریافت نہ کر سکا۔ میرے علم میں یہ واقعہ ہے کہ ایک ہندو فقیر صرف ایک دن کوئی جنگلی بوٹی کھا لیا کرتا تھا، اور ایک ماہ تک نہ اوسکو بھوک لگتی تھی اور نہ پیاس۔

مسلمان بہ حیثیت فاتح ہندوستان میں داخل ہوئے، بجز مذہب کے اون کے ساتھ نہ کوئی تمدن تھا اور نہ کوئی فلسفہ۔ آٹھویں صدی میں جب اونھوں نے ہندوستان میں قدم رکھا تو اوس وقت تک خود اُنکی قوت عمل میں اضمحلال آچلا تھا۔ عجمی آب و ہوا نے ایران ہی میں ان کا سارا خلوص و جوش ضبط کر لیا تھا۔ اب تو صرف ملک گیری کی ہوس تھی۔ نہ مذہب کی ترویج کا خیال تھا اور نہ اصول زندگی کی تبلیغ کا دھیان۔

ہندوؤں نے مسلمانوں سے ترک موالات اختیار کی جسکے باعث وہ بالکل محفوظ رہے، شمالی ہندوستان میں فارسی علم ادب نے ہندوؤں کو ضرور متوجہ کر لیا، مگر سوائے اس کے اور کوئی اثر مسلمانوں کا ہندوؤں پر نہ پڑ سکا۔ ممکن ہے کہ یہ میرا خیال ایک مناظرہ کی صورت پیدا کر دے۔ لیکن میں بے خوف یہ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں نے اپنی آٹھ سو سال کی حکومت میں کوئی تہذیب و تمدن ہندوستان کو عطا نہیں کیا، بجز چند پرانی عمارتوں کے اور کوئی ثبوت اس امر کا نہیں ہے کہ یہاں کبھی ہم حکمراں تھے بھی۔ تاج محل اور اکبر شاہ کے مقبرے، کسی گذری ہوئی حکومت کی یاد تازہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔ پھر نہ صرف یہ ہوا بلکہ ہم نے وہ بھی کھو دیا جو ہم لے کر آئے تھے۔ ہندوؤں کی جاذب قومیت نے مسلمانوں کو فنا کر دیا، حکومت محض طاقت پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اوس کے پس پشت تمدنی اخلاقی قوت ہونا چاہیئے، یہی سبب ہے کہ

جبتک مسلمانوں میں عسکریت قائم رہی وہ حکومت کرسکے۔ اور جب وہ فنا ہوئی تو یہ بھی فنا ہوگئے۔

انگریزوں کی حکومت نے ہندوؤں کی طرح کروٹ بدلی۔ ہندو تہذیب و تمدن کا یہ تیسرا دور، دور اول سے زیادہ شاندار ہے اور رہوگا۔ ابتدائی مراحل بربریت تو موجودہ تمدن نے دور کردئے اب جو نکھار ہے وہ غضب کا ہے۔ "ہندوؤں کی اخلاقی تاریخ" میں میں عرض کرچکا ہوں کہ یہ ہونہار قوم قابل رشک و تقلید ہے۔

ہندی عام ملک کی زبان ہورہی ہے، ہندی میں گزشتہ سال بجز بنگالی کے سب سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں چونکہ بنگال میں انگریزی تمدن کے آثار سب سے پہلے نمایاں ہوئے اور بنگالیوں نے سب سے پہلے انگریزی تمدن اختیار کیا اس لئے قدرتاً اوس نے ہندو قوم کی ادبی و فنی رہنمائی میں کافی حصہ لیا۔ بنگالی زبان اسوقت ملک کی مایۂ ناز زبان ہے۔ شعر و شاعری، حکمت و سائنس غرض تمامی اصناف علوم کا کافی سرمایہ اس زبان میں موجود ہے۔ اخبارات و جرائد بالکل مغربی اُصول پر مدون ہوتے ہیں۔ رسائل میں عالمانہ و ناقدانہ مضامین تحریر ہوتے ہیں، ندرت و جدت، تحقیق و تنقید اون کا طرۂ امتیاز ہے۔

اول تو ہندی و سنسکرت شاعری ابتدا ہی سے فطرتی مناظر سے مملو تھی، لیکن مغربی مذاق نے اوس میں اور لطافت پیدا کردی۔ قومی و فلسفیانہ نظمیں، اخلاقی و معاشرتی ڈرامے صدہا کی تعداد میں چھپتے ہیں۔ اور قوم میں رائج ہیں۔ رابندرانا تھ ٹیگور نے تو ایک خاص مدرسۂ شاعری کی بنیاد ڈالی ہے۔ جس نے مغرب کو بھی متحیر کر رکھا ہے۔

## چینی

دنیا کی متعدد اہم ایجادات چین سے منسوب ہیں۔ تاریخ سے مصری تمدن کا پتہ چار ہزار برس قبل مسیح تک چلتا ہے۔ اس خیال و اعتبار سے چینی تمدن نسبتاً جدید ضرور ہے، مگر مصری تاریخ معتبر نہیں کہی جاسکتی۔ برخلاف اوس کے ہمارے سامنے صحیح چینی حالات ۵۰۰۰ سال قبل مسیح تک کے موجود ہیں۔ چین کے تمام بادشاہ و حکمران اپنی حکومت کے صحیح حالات کا قلمی ذخیرہ رکھتے تھے، شاید اسکی مثال آپ کو کسی اور ملک میں نہیں ملے گی۔ یہی سبب ہے کہ گو دوسرے ملکوں کے حالات ہزارہا سال قبل مسیح کے دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن اون کو وہ صداقت نصیب نہیں۔

دنیا میں چینی زبان سے زیادہ کوئی زبان تعجب خیز نہیں۔ اوسکی پہلی خصوصیت اوس کا طرز تحریر ہے۔ ابتدائی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ چینوں کے یہاں کوئی حروف کتابت نہ تھے۔ اشارات سے آواز و معنی کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ اشارات تصویری شکلوں میں ہوتے۔ وہ جس چیز کا نام لکھنا چاہتے اوسی کی تصویر بناتے۔ تصویر کی مماثلت سے مفہوم کا اندازہ ہوتا تھا۔ اشیاء کا مفہوم تو آسان تھا، مگر لطف یہ ہے کہ صنعت کا بھی وہ اسی طرح اظہار کرتے۔ اعداد کا اظہار لکیروں سے کیا جاتا۔ ایسے مفہوم جو تصویروں سے ادا نہیں ہوسکتے تھے۔ مثلاً "روشنی" وغیرہ ان کا مفہوم دو نشانات کو ملاکر ادا کیا جاتا تھا۔ چاند و سورج کی تصویروں کا امتزاج "روشنی" کا مفہوم ادا کرتا۔

"خوشی" زچہ و بچہ کی نشانیوں سے ظاہر ہوتی۔ "امن و صلح" ظاہر کرنا ہوتا تو عورت کی نشانی کو چھت کے نیچے

دکھاتے۔ حق و صداقت کا اظہار "انسان" اور "ایک" سے کرتے۔

میں ان نشانات سے چینیوں کی اخلاقی زندگی کے متعلق ایک نہایت لطیف نتیجہ اخذ کر سکا ہوں، چینیوں کی متاہلانہ زندگی نہایت خوشگوار رہی ہوگی۔ اس لئے کہ زچہ و بچہ کی یکجائی اونکے لئے خوشی کی مرادف تھی۔ اسی طرح اون کے نزدیک عورت کا تخیل فساد آمیز نہ رہا ہوگا، آج کل ہندوستان میں ایک ضرب المثل رائج ہے، جو گو رکیک ہے، لیکن اس سے ہندوستانی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ "زن، زمین، زر، یہ جھگڑے کا گھر" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج ہندوستانی ذہنیت عورت کو کن نظروں سے دیکھتی ہے، اس خیال کا اثر عورت و مرد دونوں کی اخلاقی زندگی پر پڑتا ہے۔ چینیوں کی صداقت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کا "واحد القول" ہونا ضروری سمجھتے تھے۔

چینی زبان کی دوسری خصوصیت اس کا لب و لہجہ ہے ایک ہی لفظ مختلف لہجہ و تلفظ میں مختلف معنی رکھتا ہے اس سے گو اونکی زبان کی کم مایگی کا پتہ چلتا ہے، لیکن دوسری طرف اون کی زبان سے "حسن اجمال" بھی مترشح ہوتا ہے ایک لفظ "فینگ" کو لے لیجئے۔ یائے معروف کے ساتھ اوس کے معنی "مکان" کے ہیں۔ یائے مجہول کے ساتھ "کاتنے" کے ہیں، اور "ی" کو اگر کھینچکر پڑھیے تو اوسکے معنی "آزاد کرنا" ہے۔

چینیوں کی تیسری خصوصیت اون کا "ذوق حسن" ہے، آپ اونکی ہر صنعت و حرفت میں تناسب حسن اور استقلال پائیں گے۔ ہزارہا سال قبل از مسیح کے مٹی کے برتنوں پر بھی جو نقش و نگار پائے جاتے ہیں، اون سے بھی ذوق حسن کا پتہ چلتا ہے، ڈنی سن راس مشہور مستشرق کا خیال ہے کہ چینی مذموم و بدنما صنعت کی اہلیت ہی نہیں رکھتے، آپ چینی تعمیرات میں کبھی بھی ناموزونیت اور خشونت نہ پائیں گے۔ اور اوس پر لطف یہ ہے کہ وہ پائیداری میں بھی آپ اپنی نظیر ہیں، دیوار چین، چینیوں کی مستحکم و مستقل طبیعت کا ایک نمونہ ہے، اون کی عبادتگاہیں اکثر چوبی ہوتی ہیں، لیکن جب کبھی وہ سنگ مرمر کا استعمال کرتے ہیں تو نہایت قابل تعریف ہوتا ہے۔

سکندر اعظم نے جب ہندوستان فتح کیا، تو یونانی اُصول نقاشی کا ملک میں رواج ہوا اور یہاں سے بدھ مذہب کے مبلغین و معتقدین نے چین میں جاکر اوسکو رواج دیا۔ اس طرح چین کے اُصول نقاشی میں یونان کی مغربیت اور ہندوستان کی مشرقیت کا لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔

چین کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں بھی نقش و نگار کا مذاق پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ سیاہ و آبی رنگ آمیزی کا رواج عام تھا، وہ کبھی کبھی ریشمی کپڑوں پر بھی نقش و نگار بناتے تھے۔ چینی اصول نقاشی کی کلید "صوری اثرات" ہیں، ناظرانہ حقیقت کے بجائے اون سے شاعرانہ تجویز مترشح ہوتی ہے تصویروں میں عکس و سایہ کا نام نہیں۔ متقدمین میں جن سے زیادہ خوشنما تصویر چراگاہ کی آج تک کسی نے نہیں بنائی۔ پہاڑ اور ابر کی تصویروں میں مصنوعی اثرات کو زیادہ دخل ہوتا تھا۔

وہ چراگاہ کی تصویروں کو مسلسل کئی قطعات میں دکھاتے۔ ایسی تصویروں کو لکڑی میں لپیٹ کر کھلے ہوئے صندوق میں رکھتے، اور لکڑی کے ایک کنارہ کو گھماتے، اس طرح تصویر کا ہر قطعہ رفتہ رفتہ نظروں کے سامنے آتا جاتا۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ سینما کی ایجاد کا پہلا زینہ ہے۔

چینی اپنے مورث و آباؤ اجداد کی روحوں کی پرستش کرتے ہیں۔ اون کا اعتقاد ہے کہ مرنے کے بعد بھی مُردوں کی روحیں خاندان کی عملی زندگی میں دخیل رہتی ہیں۔ ہر گھر میں ایک صندوق ہوتا ہے، جس میں روحوں کا قیام خیال کیا جاتا ہے۔ ہر اہم موقعہ پر عمدہ عمدہ کھانے اوس صندوق کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔

ہندوؤں کے اصول حیات چینیوں کے فلسفۂ زلیت سے بالکل مختلف ہیں۔ ہندو فلسفہ کے دلدادہ ہیں، لیکن چینیوں کو علم اخلاق میں بے حد شغف ہے، کنفوشیس کے اُصول مذہب سے غیر متعلق ہیں۔ چینیوں کی سیاسی و اخلاقی زندگی دونوں علم اخلاق پر مبنی ہیں۔ ایرانیوں کے خلاف چینی ذہنیت بیحد قدامت پسند ہے۔ وہ کبھی بھی بیرونی اُ گرد و پیش سے خود کو مطابق نہیں بنا سکتے۔

اٹھارہویں صدی کی ابتدا تک چینی ذخیرہ ادبیات کا کوئی ملک مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ نجوم، جغرافیہ، علم الابدان وغیرہ وغیرہ تمام علوم پر اونکی نہایت عالمانہ تصنیفات موجود ہیں۔

پندرہویں صدی میں حکومت کی ایماء سے گیارہ ہزار جلدوں میں ایک انسائیکلوپیڈیا تیار ہوئی۔ ہر جلد دو نسخوں میں مرتب کی گئی۔ ہر جلد کا ایک نسخہ سولھویں صدی میں نذر آتش کر دیا گیا۔ دوسرے نسخہ جات باکسر کے غدر تک پیکنگ میں موجود تھے۔ اسوقت صرف سو جلدیں موجود ہیں بقیہ سب ضائع ہو گئیں۔

جیسا میں عرض کر چکا ہوں، آپ چینیوں کے ہر شعبۂ زندگی میں علم الاخلاق کی تبلیغ کا اثر پائیں گے۔ اون کا ہر ادیب ناصح ہے، اور اون کا ہر شاعر واعظ۔ اس میں شبہ نہیں کہ چینی ادبیات موجودہ اُصول تنقید کا بار نہیں اُٹھا سکتے۔ بااینہمہ چین میں چند ایسے شاعر گزرے ہیں جنکا کلام کسی طرح غیر موقر نہیں سمجھا جا سکتا۔

زمانہ قدیم سے چینیوں کو شاعری سے شغف ہے، علم عروض کے اُصول گو دقیق ہیں، لیکن چینی شاعری اونکی سکون طلب زندگی اور مطمئن ذہنیت کا پتہ دیتی ہے۔

## دور جدید

زمانہ کے انقلاب نے چینیوں کی بھی آنکھیں کھول دی ہیں۔ تین چوتھائی ملک افیون کا عادی تھا مگر چینی حکومت نے افیون کی درآمد قطعی بند کر دی۔ بیرونی حریت سوز اثرات کلیتًا نابود ہو گئے، لیکن ابھی تک ملک کو وہ اطمینان حاصل نہیں ہے، جس کی عافیت پرور آغوش ادبیات و فنون کی ترقی کے لئے ضروری ہے قومی ترقی کی ابتدا و انتہا دونوں شاعری سے ہوتی ہے، چونکہ صحیح جذبات ترقی کے پیش خیمہ ہیں اور شاعری جذبات کا آئینہ ہے۔ اس لئے قومی ترقی کے ابتدائے مراحل میں شاعرانہ تخیل بیحد معین ہوتی ہے۔ لیسا اوقات تو

یہ لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ چینیوں نے خواب غفلت سے جو کروٹ لی تو اونھیں اپنی کمزوریاں محسوس ہوئیں۔ اور اُنھوں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ اون کی بدبختیوں کی تمامتر ذمہ داری استبدادی حکومت پر ہے، چنانچہ اونھوں نے سب سے پہلے اس کو فنا کیا، اور جب جمہوریت قائم ہو گئی تو ذہنیت بھی بدلنے لگی۔ چنانچہ موجودہ ذہنیت کا اندازہ مذکورۂ ذیل کلام سے ہو گا:۔

(۱) غلامی کا دوسرا نام موت ہے۔ زندگی و آزادی مرادف الفاظ ہیں۔ اے موت تو آ۔ اور مجھے غلامی سے نجات دے۔ اس لئے کہ تیری نیش زنیاں حکومت کے بیہم مظالم سے کم نہیں۔ آ۔ اور جلد آ۔

(۲) اے قوم پرستو! اگر تم حصول ذرائع میں متحد نہیں ہو سکتے تو نہ ہو، لیکن خدا کے لئے مقاصد کا اختلاف نہ اختیار کرو، اس لئے کہ اختلاف مقصد موت کا پیش خیمہ ہے۔

(۳) زندگی صرف شجاعانہ زندگی کا نام ہے، فطرتی طرز موت سے اگر تم ہلاک ہوئے تو وہ طرز موت عامیانہ ہے اگر تم نے اسوقت معین کو اپنی شجاعت سے پہلے بلا لیا تو تم خاصان خدا میں ہو۔

سید یامین ہاشمی ایم۔ اے


## تریاق درد

درد سے زیادہ تکلیف دہ چیز انسان کے لئے کوئی نہیں اور بعض اوقات محض درد کی شدت سے ہلاکت ہو جاتی ہے۔ اس لئے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر پندرہ منٹ کے اندر درد کا دور کرنا آپ کے اختیار میں ہو تو کتنی بڑی نعمت آپ کو حاصل ہے۔

یہ نعمت آپ کو نہایت آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے اور ہر قسم کے درد میں خواہ وہ سر کا ہو یا آنکھ کا کان کا ہو یا دانت کا، پیٹ کا ہو یا گردہ کا، پھوڑے کا ہو یا کمر کا، قولنج کا ہو یا ریاح کا آناً فاناً دور ہو سکتا ہے۔

سید حسن امام صاحب رئیس گیا کے شانہ میں مہینوں سے درد تھا اور کسی طرح نہیں جاتا تھا لیکن اس دوا کے استعمال سے آدھ گھنٹے کے اندر جاتا رہا۔ جناب محمد ولایت خاں صاحب انجنیر محمود آباد کے دانت میں سخت درد تھا۔ لیکن اس دوا سے فوراً سکون ہو گیا اسیطرح چودہری شفیق الزماں صاحب رئیس لکھنؤ، جناب مولوی فتح اللہ صاحب مولوی گنج لکھنؤ، اور متعدد حضرات کے تجربات اسکی نسبت ہیں۔ اس دوا کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ اور اس کا اثر بالکل معجزہ کی صورت سے ہوتا ہے۔

قیمت ایک درجن پڑیا تین روپے علاوہ محصول قیمت نصف درجن ایک روپیہ بارہ آنے علاوہ محصول

سنٹرل فارمیسی۔ ۳۵ امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ

# ایک چتا میں دو شعلے

(بہ سلسلۂ ماسبق)

صبح صادق کا وقت تھا۔ اسوقت گھاٹ کے کنارے کچھ عجیب منظر ہوتا ہے، صبح بنارس سے کون ناواقف ہے۔ شہر کی معزز عورتیں اسی وقت اشنان کرنے آتی ہیں۔ اور فارغ ہوکر اندھیرے سے گھروں کو واپس جاتی ہیں۔ کسوم نے اُن موجوں کو جو گھاٹ کی سیڑھیوں سے ٹکرا رہی تھیں پیار کے انداز سے دیکھا اور وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا کر بولی:۔

"اے میرے پیدا کرنیوالے تو خوب جانتا ہے کہ میری کلفتیں برداشت کی حد سے بڑھ گئی ہیں۔.... کبھی نہ ختم ہونیوالی تکلیفوں نے میرا کلیجہ چھلنی کردیا ہے۔ اور پھر اس آخری چوٹ نے تو مجھے کسی قابل ہی نہیں رکھا۔ مجھے اسکا فخر ہے کہ جان بوجھکر میں نے آج تک کوئی کام تیرے حکم کے خلاف نہیں کیا۔ لیکن اگر بھولے سے کوئی لغزش ہوئی ہو تو اے پرماتما اُسے معاف کردے۔ میں تیرے حضور میں خود آرہی ہوں، اپنے کرم کے صدقے میں مجھے وہاں آرام دینا"۔

کسوم آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی آخری سیڑھی تک پہونچی۔ اور قریب تھا کہ وہ پانی میں کود کر دنیا سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوجائے کہ ایک بوڑھی عورت نے جو اُس کی تمام باتیں کھڑی سُن رہی تھی اس کی کمر کو پوری طاقت سے پکڑ لیا۔ کسوم نے چھڑانے کی کوشش کی، لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو لجاجت سے کہا کہ "پرماتما کے لئے مجھے مرنے سے نہ روکو"

بوڑھی عورت نے شفقت سے کہا:۔ "بیٹی تیری عمر اس قابل نہیں کہ تو ایسے ارادہ پر تل جائے۔ ابھی دنیا کو تیری ضرورت ہے اور تجھ کو دنیا کی۔ جس پرماتما نے تجھے دکھ دیا ہے وہی آرام بھی دے گا"۔

بوڑھی عورت کی گفتگو میں اس قدر صداقت و متانت تھی کہ ناچار کسوم کو اپنے ارادوں سے باز آنا پڑا۔ اس نے گھاٹ سے کسوم کو الگ لیجا کر تسلی تشفی دی اور پوچھا "بیٹی تیرا گھر کہاں ہے؟" کسوم نے سسکتے ہوئے کہا کہ "اس دنیا میں کوئی نہیں۔" بوڑھی عورت جو بشرے سے شریف و معزز معلوم ہوتی تھی۔ بہت خوش ہوئی۔ بولی "بیٹی تو میرے ساتھ چل مجھے خدا نے کوئی لڑکی نہیں دی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تجھے اپنی لڑکی کی طرح جانوں گی"۔ عورت کی چتون سے اسقدر شرافت ظاہر ہورہی تھی کہ کسوم نے ساتھ ہونے میں کوئی تامل نہ کیا۔ اگرچہ اسکو کوئی خوشی اس سے نہیں ہوئی۔ بوڑھی

عورت جسکو لوگ ماتاجی کہتے تھے۔ کسوم سے بہت محبت اور پیار سے پیش آتی۔ یہاں تک کہ کسوم کا غم ایک حد تک غلط ہو گیا۔ ماتاجی ایک روز غیر معمولی طور پر خوش نظر آرہی تھیں۔ کسوم نے پوچھا تو کہا کہ "تیرے بھائی جو کچھ دنوں کے لئے کلکتہ گئے ہوئے تھے اور وہیں سے نینی تال چلے گئے تھے۔ ان کا خط آیا ہے اسی ہفتہ میں آنیوالے ہیں۔"

---

نینی تال پہنچتے ہی کنول کو افاقہ ہونے لگا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ اس قابل ہو گئی کہ شیام نرائن کے ساتھ پہاڑوں اور چشموں کی سیر کرنے جایا کرتی۔ شیام نرائن کنول کی بلا کی ذہانت اُس کی طباعی اُس کے انداز گفتگو کو قدر کی نگاہ سے ضرور دیکھنے لگا تھا۔ لیکن کنول کی خلش کی کوئی انتہا نہ رہتی جب وہ دیکھتی کہ شیام نرائن پر کوئی غیر معمولی اثر نہیں ہے۔ جب وہ دونوں چہل قدمی کے لئے جاتے ہوئے کسی آبشار کے قریب یا گھاٹی میں کچھ دیر کے لئے بیٹھ جاتے اور کنول ایک سنجیدہ سکون کے ساتھ اپنی تمام دلآویزیوں کو صرف کرتی۔ تو شیام نرائن اپنی معمولی بے نیازی سے کنول کی طرف دیکھتا اور کنول کی کرشمہ سازیوں کو ایک ناقابل برداشت ٹھیس لگتی۔

شکست کا خیال کبھی کنول کے دماغ میں آیا ہی نہ تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اپنے نہایت معمولی حربہ سے وہ ہر طاقت کو نیچا دکھا سکتی ہے۔ لیکن شیام نرائن کی مستقل خودداری نے اس کے تمام منصوبوں کو درہم برہم کر رکھا تھا اور ان کی اسی مستقل مزاجی سے جہاں اسکی فطرت کو چوٹ پہنچتی تھی وہیں اس کو ایک مسرت بھی حاصل ہوتی تھی۔ وہ اکثر نفسیات کی نازک بحثیں چھیڑ کر شیام نرائن کے حسیات کا امتحان لیا کرتی۔ جہاں تک ہوتا ان مباحثوں میں شیام نرائن ایک سنجیدہ اختصار سے کام لیتا جس سے کنول کی گرمیاں اور بڑھ جاتیں۔

ایک روز شیام نرائن برج نرائن بابو کے پاس تنہا بیٹھا تھا باتوں باتوں میں ایک مختصر سی تمہید کے بعد اس نے اسکی درخواست کی کہ برج نرائن بابو کنول کا ہاتھ اسکے ہاتھ میں دیدیں۔ برج نرائن بابو راج کشور سے مایوس ہو چکے تھے۔ پھر شیام نرائن کی شرافت اور لیاقت بھی بخوبی دیکھ اور سُن چکے تھے۔ بولے کنول اگر راضی ہے تو مجھے کوئی انکار نہیں۔

شام کو شیام نرائن اور کنول حسب معمول ٹہلنے کے لئے گئے۔ ایک گھاٹی پر جو ایک غیر معمولی بلندی پر واقع تھی دونوں نے چڑھنا شروع کیا۔ کنول ہنوز کمزور تھی۔ چنانچہ شیام نرائن نے اس کو اپنا ہاتھ دیدیا جس کی مدد سے کنول گھاٹی تک چڑھ گئی۔

گھاٹی خود ہی بہت دلکش تھی اور اسکے چاروں طرف کے مناظر بھی حد درجہ فرحت بخش تھے۔ آبشار اپنی سیمیں چادر سے دامن کوہ کو مالامال کر رہی تھی، پانی کے کنارے سبزہ بہاؤ کے زور سے ہر لحظہ جنبش میں آجاتا تھا۔ کنول نے تیز بہتے ہوئے پانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:۔

"دیکھئے دنیا میں کسی شئے کو قرار نہیں۔ آبشار کا شفاف پانی جو حد درجہ دلکش ہے ایک نامعلوم جستجو میں ہمیشہ سرگرداں ہے"۔ شیام نرائن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا" ہاں کنول زندگی کے لطف کا راز جستجو اور کاوش ہے دنیا پر اگر جمود کا غلبہ ہو جائے۔ تو ہماری تمام امنگیں سرد پڑ جائیں۔ ہماری بلند آرزوئیں پست ہو جائیں۔ ہماری سرگرمیاں سرد ہو جائیں اور دلچسپی ایک فضول شے ہو جائے"۔ کہتے کہتے شیام نرائن یک بیک خاموش ہو گیا اور کچھ دیر کے بعد بولا :"کنول کچھ واقعات کی بنا پر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس چند روزہ زندگی کو تنہا رہ کر گزار دوں گا۔ لیکن کچھ دنوں سے یہ مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ ایسی زندگی بسر کرنا قدرت کے خلاف ایک بغاوت ہے، جس کے لئے میں کسی طرح تیار نہیں۔ ایسی حالت میں کیا تم میری رفیق زندگی بننا پسند کرو گی" کنول سکتہ میں آگئی۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ شیام نرائن کی ذات کو تمام ہستی سے بالاتر سمجھنے لگی تھی"۔ اس کے سامنے وہ اپنی تمام فاتحانہ ادائیں بھول جاتی۔ کنول کا چہرہ ایک فوری جذبہ سے سُرخ ہو گیا۔ اور وہ عرق عرق ہو گئی۔ شیام نرائن نے یہ دیکھکر کہا" کنول اگر میں نے یہ کہکر تمکو تکلیف پہونچائی ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لے لیتا ہوں۔ تم مجھے معاف کر دو۔ کنول نے کچھ کہنا چاہا۔ اس کی زبان خشک ہو گئی۔ اس نے بے اختیار شیام نرائن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شیام نرائن کنول کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر بولا:" میں نے تمہارے پتا جی سے اس کے لئے کہا تھا۔ ان کو کوئی انکار نہیں۔ ہاں بشرطیکہ تم راضی ہو۔ شیام نرائن نے کنول کو زیادہ دیر تک اس ہیجان میں مبتلا رکھنا مناسب نہ سمجھکر اسکا ہاتھ پکڑا اور کہا:" چلو واپس چلیں"!

بنارس میں سالانہ اشنان کا میلہ ہونیوالا تھا۔ کنول اب بالکل تندرست ہو گئی تھی۔ شیام نرائن کے اصرار سے میلہ میں شریک ہونے کے لئے وہ دونوں بھی تیار ہو گئے، اور سب لوگ اسطرح بنارس آگئے۔

باوجود شیام نرائن کے اصرار کے برج نرائن بابو دریا کے کنارے ایک مکان کرایہ پر لیکر میلہ کا انتظار کرنے لگے۔ طے یہ پایا کہ میلہ کے بعد کنول اور شیام نرائن کی شادی کر دیجائے۔

---

نول کشور کی بی بی جو صبح کو اُٹھیں تو اپنے سرہانے دو خط پڑے پائے۔ ایک تو بند تھا اور دوسرا کُھلا ہوا تھا۔ اسپر یہ عبارت لکھی تھی:

"پیاری بہن۔ یہ حد درجہ کی بد اخلاقی ہے کہ آپ کی بے انتہا عنایات اور اخلاص کا شکریہ ادا کئے بغیر یوں یک بیک آپ سے جدا ہو جاؤں۔ لیکن قدرت کے کرشمے انوکھے ہیں۔ پس آپ یہ یقین کر لیں کہ میری مجبوری اسکی ذمہ دار ہے۔ جب وکیل صاحب کلکتہ سے آئیں تو دوسرا خط ان کو (صرف اُنھیں کو) دیدیجئےگا"۔
"کسوم"

نول کشور کی بی بی گھبرائی ہوئی کسوم کے کمرہ میں گئیں۔ سب چیزیں بدستور پائیں۔ کسوم البتہ نہیں تھی۔ وکیل صاحب

کو بلا کر سب حال سُنایا۔ وکیل صاحب بیچارے پریشان ہو گئے دو پہر تک بیکار تلاش کرنیکے بعد راج کشور کو ذیل کا تار دیا:۔

"جس قدر جلد ممکن ہو بکسر آؤ"

کنول کا خط ملنے کے بعد جو کیفیت راج کشور کی ہوئی وہ عجیب تھی۔ معلوم نہیں وہ خیالات کے کن دشوار گذار مراحل کو طے کر رہا تھا کہ ہر وقت اس کا چہرہ تمتمایا رہتا، اور اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے، کنول کے لئے اس نے کس کس طرح اپنے ضمیر کا خون کیا تھا۔ حقیقت سے کسوم کو ناآشنا رکھنا یا انکشاف حقیقت کر کے دوبارہ اس سے جائز طور پر رشتہ نہ قائم کرنا اس کا جوابدہ وہ کنول کو تصور کرتا تھا۔ اس کے اسطرح کھو جانے سے راج کشور کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ عنصر جس سے اس کے جذبات میں گرمی اور حرارت پیدا ہوتی تھی اس سے یکبارگی چھین لیا گیا ہے۔

ان خیالات کا سلسلہ جب ختم ہوتا تو اُس کے دل میں ایک خلش سی پیدا ہوتی۔ اور اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح کسوم کی ذات سے ہوتا۔ اس کو خوب معلوم تھا کہ اس کی بے پرواہی نے کسوم کے دل کا بُری طرح خون کیا ہے اس کا ضمیر کسوم کی پاک زندگی کے تباہ کرنے پر اسکو بے انتہا نفرین کرتا۔ اس کو بعض وقت یہ بھی خیال ہوتا کہ اب اگر تمام یکسوئی کے ساتھ بھی کسوم کی دلدہی کیجائے جب بھی اس کی کلفتوں کی تلافی ممکن نہیں۔ بہر حال وہ قریب قریب طے کر چکا تھا کہ جو کچھ بھی ہو کسوم سے صرف کنول کا واقعہ محفوظ رکھتے ہوئے تمام حقیقت بیان کر دیجائے، اور پھر اگر کسوم راضی ہو جائے جسکی اُسے امید تھی تو وہ کنول کا خیال دل سے نکال کر کسی طرح یہ چند روزہ زندگی گذار دے۔ اب جو اسکو یہ تار ملا تو اس کے دل سے یہ آواز آنے لگی کہ ہو نہ ہو کسوم بھی اس سے ہمیشہ کے لئے چھین لی گئی۔ وہ حد درجہ سراسیمہ بکسر پہنچا۔ بابو نول کشور نے جو کسوم کے یک بیک غائب ہو جانے کا حال اس سے تبلایا تو وہ سر دوڑ پڑ گیا۔ اُسے یہ معلوم ہونے لگا کہ دنیا کی تمام ہستیاں اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہی ہیں۔ یہ احساس اُس کے لئے سوہان روح تھا کہ اس دنیا کی ایک انتہائی پاک اور معصوم ہستی کا خون اُس کی گردن پر ہے۔ مواخذہ کے خیال سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے بے شمار خوفناک اور کریہہ المنظر شکلیں دکھلائی دے رہی تھیں، جو ایک طنزیہ ہنسی سے اس کو اپنی طرف آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا اور کچھ دیر کے لئے اس کی ایسی کیفیت ہو گئی کہ نول کشور بابو سہم گئے۔ لوگوں نے سر پر برف رکھا شربت کے قطرے حلق سے اُتارے۔ بارے کچھ دیر کے بعد راج کشور کی طبیعت قدرے سنبھلی تو نول کشور نے کسوم کا خط جو راج کشور کے نام کا تھا لا کر دیا۔ راج کشور نے ایک سرد ہیجان کے ساتھ لفافہ کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔

"راج کشور بابو۔

آپ نے جو خط میرے لئے لکھا تھا وہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آج میرے ہاتھ پڑ گیا۔ ایسی حالت میں مجھے یہاں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ممکن ہے کہ میں آپ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوتی ہوں۔ اس لئے اُن تمام کلفتوں کی جو میری وجہ سے آپکو خواہ مخواہ برداشت کرنا کرنا پڑیں۔ معافی چاہتی ہوں۔ چونکہ اپنے تاریک مستقبل سے قطعی ناآشنا ہوں میں نہیں

کہہ سکتی کہ کہاں جارہی ہوں؟ آپ میری جستجو کی کوشش نہ کیجیئے گا۔ "کسوم"

راج کشور پر متواتر کچھ اسطرح صدمے گذرے کہ وہ متوحش ہو کے رہگیا، وہ جسقدر اپنی حالت پر غور کرتا اُسکو اپنے آپ سے نفرت ہوتی جاتی۔ اس کے جانگداز احساسات عمیق تر ہوتے جاتے۔ اسکو یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کی روح ایک عمیق ترین غار میں جا پڑی ہے۔ جہاں سے وہ واپس نہیں آسکتی۔ رہ رہ کر اُس کے کلیجہ سے دھواں سا اُٹھتا، اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ اُسے بکسر میں حد درجہ کی وحشت ہونے لگی۔ گھبرا کر وہ کلکتہ واپس گیا۔ لیکن چونکہ سکون وہ کھو چکا تھا۔ اس لئے اُس کی کلفتیں بڑھتی گئیں اور اس کی صحت بھی بُری طرح برباد ہونے لگی۔

---

شیام نرائن اور کنول کو بنارس آئے ہوئے دو ہفتہ ہو گئے۔ کسوم کے متعلق ماتا جی نے ایک مجمل سا حال شیام نرائن کو بتلا دیا۔ جستجو کرنا شیام نرائن کی عادت کے خلاف تھا۔ اس لئے اُس نے اور کچھ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن باوجود ارادی غفلت کے شیام نرائن یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ کسوم کی معصوم نگاہوں میں کسی بالاتر عالم کا راز پنہاں ہے۔

کنول بھی کسوم کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی لینے لگی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اسکو کسوم سے کوئی اخلاص تھا یا کیا، بہرحال یہ واقعہ ہے کہ وہ شیام نرائن کی غیر حاضری میں دیر تک کسوم کے ساتھ بیٹھی رہتی۔ کنول کلکتہ یونیورسٹی کی گریجویٹ تھی۔ لیکن سیدھی سادھی کسوم کے سامنے وہ اپنی تمام قابلیت بھولجاتی۔ کسوم کو وہ قدرت کی تکمیلات کا ایک بیش بہا نمونہ سمجھنے لگی تھی۔ اور اُس کو اس کا اعتراف تھا کہ کسوم کے پاک جذبات کا جواب دینے سے اس کا تمام علم قاصر تھا اُس کو کسوم کو دیکھ کر یہ حقیقت اُس پر واضح ہو گئی تھی کہ وسعت دماغی یا کمال تمدن نسائیت کا اصل مدعا نہیں۔ بلکہ عورت کی کبھی نہ فتح ہونے والی قوت جس کے ایک معمولی کرشمہ سے وہ دنیا کو اپنا گرویدہ بنا سکتی ہے۔ ان تمام تحصیلات سے بالاتر ہے۔ کسوم کنول کی فطرت سے گھبراتی ضرور تھی، مگر اس کا خمیر محبت اور اخلاص سے تھا۔ کنول کے انہماک کو وہ ٹھکرا نہ سکی۔ اور ان دو متضاد ہستیوں میں ایک بہناپا قائم ہو گیا۔ کنول اکثر کسوم کا حال پوچھتی، مگر وہ یہ کہکر ٹالدیتی کہ "سُن کر کیا کرو گی؟"

ایک روز کنول اس پر تُل گئی کہ جو کچھ بھی ہو وہ سُن کے رہیگی۔ کسوم نے حیلہ حوالہ کیا تو کنول نے رنجیدہ ہو کر کہا "بہن تمہارا کچھ قصور نہیں یہ میری فطرت کا قصور ہے کہ میں اعتبار کے قابل نہیں"۔ یہ کہکر کنول کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کسوم سے کنول کی یہ حالت نہ دیکھی گئی اور بولی "یہ تو میں تمکو چھیڑنے کے لئے کہتی تھی۔ کنول سنو۔ مگر تمہارا اگر دل ملول ہو جائے گا"۔ یہ کہکر کسوم نے آنکھیں زمین سے گڑا لیں۔ اور اجمالاً اپنی بیتی۔ عہد طفولیت، شادی، طوفان۔ راج کشور سے سابقہ۔ پھر راج کشور کا حقیقت سے آشنا ہو کر اس سے کچھ دنوں کنارہ کش رہنا، لیکن اس کو

لاعلم رکھنا، پھر اس کا اسکول میں داخل ہونا۔ بکسبر آنا۔ وہاں اتفاقیہ راج کشور کی تحریر کے ملنے کے بعد کاشی آنا اور ماتاجی کا اس کو مرنے سے روک کر گھر لانا ـــــ سب بتلا دیا۔ یاد ماضی نے کسوم کا غم تازہ کر دیا۔ اور کچھ دیر تک وہ سسک سسک کر زار و قطار روتی رہی۔ کنول بہت متاثر ہوئی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ کسوم کو تسلی تشفی دلائے۔ لیکن اس کے منہ سے ایک حرف نہ نکل سکا، اور وہ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اُٹھی اور خدا حافظ کہکر اپنے گھر چلدی۔

---

کنول نے کسوم کے بیان سے اتنا گہرا اثر لیا تھا کہ شام کو جب شیام نرائن کے ساتھ وہ ٹہلنے گئی تو بالکل خاموش تھی۔ شیام نرائن نے کہا "تم بہت مضمحل معلوم ہوتی ہو۔ گھر چلو تم کو کچھ دوا دوں؟ کنول کو دوا تو پینی تھی نہیں، لیکن جب شیام نرائن گھر چلنے کے لئے واپس ہوا تو وہ اُس کے ساتھ غیر ارادی طور پر ہو گئی۔ گھر پہنچکر کنول نے کہا "کہ میں اچھی ہوں۔ دوا کی ضرورت نہیں"۔

کنول نے کہا "یہاں گرمی ہے آؤ کوٹھے پر چلیں"۔ اپنی درد بھری داستان دوہرانے کے بعد کسوم کچھ ایسی مضمحل ہو گئی کہ وہ ماتاجی سے یہ کہکر کہ طبیعت بھاری ہے۔ کوٹھے پر برآمدہ میں ایک چارپائی ڈال کر پڑ رہی وہ اسیطرح ایک نیم غنودگی کی کیفیت میں پڑی تھی۔ کہ کنول اور شیام نرائن آئے اور کسوم سے بے خبر کمرہ میں بیٹھ گئے۔

کچھ دیر کے بعد کنول نے پوچھا "آپ نے شادی کے متعلق میری رضامندی دریافت فرماتے ہوئے یہ کہا تھا کہ آپ نے بعض اسباب کی بنا پر شادی کا خیال چھوڑ دیا تھا۔ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو کیا میں آپ سے پوچھ سکتی ہوں کہ وہ کیا بات تھی؟ جس نے آپ کو میری صنف سے اس قدر مایوس کر دیا تھا"۔ شیام نرائن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا:۔

"کنول مایوس ہونے کا کوئی سوال نہ تھا۔ اب تم نے پوچھا ہے تو سُن لو ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنیکے بعد میرا ارادہ ہوا کہ کلکتہ ہی میں کچھ دنوں کسی پرانے ڈاکٹر کے ساتھ مشق کروں۔ جب ڈاکٹر کے ساتھ میں نے اپنی مشق شروع کی اُنکے پاس میرے ہی ساتھ کے ایک اور ڈاکٹر شیو کمار مشق کے لئے آیا کرتے تھے۔ انکا مکان پٹنہ کے قریب ایک موضع کرن پور میں تھا"۔ "کرن پور" کنول چونکی۔ صبح کو وہ کسوم سے سُن چکی تھی کہ اس کا وطن کرن پور تھا۔ شیام نرائن نے کہا "ہاں کرن پور میں تھا۔ ایک مرتبہ شیو کمار بہت اصرار سے مجھے اپنے گھر لے گئے۔ ازدواج کے مسئلہ پر مجھسے اور شیو کمار سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ اس کے لئے شادی کے پیغامات آتے تھے، لیکن اُس نے کسی کا صاف جواب دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ شادی ایسی جگہ کرے۔ جہاں سے معقول رقم ہاتھ لگے۔ میں ہمیشہ اُس کے اس خیال سے جھگڑتا رہا۔ چنانچہ کرن پور جانے پر چونکہ بیکاری تھی۔ اس مسئلہ پر اکثر گفتگو رہا کرتی۔ میں یہ کہا کرتا تھا کہ شادی سوسائٹی کا ایک اصول ہے، اور ہر اصول اسلئے وضع ہوتا ہے کہ اس کا کوئی مقصد ہو۔ اور اس طرح ازدواج کا نصب العین سوسائٹی کے بگڑتے ہوئے افراد کی زندگی کو سنبھالنا ہے۔ ایک ہونہار اور لائق جوان ہونے کی حیثیت سے تمہارا یہ فرض ہے کہ تم اپنی شریک زندگی کے لئے

اُس فرد کو انتخاب کرو جس کی حالت اسکی محتاج ہو کہ تمہاری مدد سے اس کی زندگی ٹھکانے لگ جائے۔ اس طرح تم سوسائٹی کے ایک فرد کو ظاہری بربادی اور باطنی ہلاکت سے بچا کر ازدواج کا مقصد پورا کروگے۔ اگر تم نے برخلاف اسکے اپنے لئے ایک ایسا انتخاب کیا جس سے تم کو ہر قسم کے دنیاوی فائدے کی امید ہے تو تم اُس فرد کی حق تلفی کروگے جسکی حالت تمہاری امداد کی محتاج تھی۔ اور اس طرح تم سوسائٹی کے دو افراد کی زندگی برباد کرنیکے ذمہ دار ہوگے۔ شیو کمار اگر ازدواج میں یہ مقصد جو میں کہہ رہا ہوں نہ پنہاں ہوتا تو میں اس کو ہرگز ایک پاک رشتہ نہ تصور کرتا بلکہ یا تو اسے ایک جذبۂ شہوانی کہتا۔ یا خود غرضی اور دنائت"۔

ایک روز دورانِ گفتگو میں شیو کمار نے کہا کہ آپ بڑے رفارمر بنتے ہیں۔ دوسرے کی زندگی درست کرنیکا بڑا خیال ہے۔ پڑوس میں ایک نہایت شریف خاندان کی لڑکی پنڈت جی کے یہاں رہتی ہے۔ اُس کے والدین بچپن ہی میں مرچکے ہیں۔ اس کے بعد وہ پنڈت جی کے یہاں رہتی ہے۔ لڑکی بیچاری میں نے سنا نہایت خوبصورت اور نیک ہے۔ لیکن پنڈتائن اور اُن کی لڑکیوں نے اس کی جان مصیبت میں کر رکھی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اکثر کہتی ہے کہ میں اپنی جان دیدوں گی۔ لوگ اُس کی پیاری پیاری صورت اور سیدھے پن پر بہت ترس کھاتے ہیں۔ لیکن کوئی اُس کی مدد کو نہیں پہنچتا۔

تم آپ اگر سوسائٹی کے ایک فرد کو تباہی سے بچانا چاہتے ہیں، تو اس سے شادی کرلیجئے۔ پھر میں سمجھوں کہ جو تم کہتے ہو اس میں کچھ خلوص بھی ہے۔

میں نے کہا:۔ شیو کمار میں جو کچھ کہتا ہوں اُس کو اپنے دل کے ہر ہر گوشہ میں صداقت اور اخلاص کے ساتھ محسوس کرتا ہوں۔ اگر واقعی میری وجہ سے ایک غریب لڑکی کی زندگی ٹھکانے لگ جائے تو میں سمجھونگا کہ مقصد حیات پورا ہوگیا۔" مختصر یہ کہ شیو کمار کے ذریعہ سے بات طے ہوگئی اور اُسی ہفتہ کے اندر سیدھے سادھے طریقہ سے میری اس لڑکی کے ساتھ شادی ہوگئی۔ شادی کے دوسرے ہی روز باوجود شیو کمار کے اصرار کے میں مع اپنی بیوی کے کلکتہ آنے کے لیئے تیار ہوگیا۔ پنڈت جی نے بھی مان لیا۔ راستہ میں کچھ دور کے لئے کشتی کا سفر تھا۔ ہم لوگ جب کشتی سے جارہے تھے۔ ایک نہایت سخت طوفان اُٹھا اور ملاحوں کی باوجود سخت احتیاط کے کشتی اُلٹ گئی۔

مجھے جو ہوش آیا تو میں پانی کے کنارے پڑا تھا۔ لیکن کسی اور کا پتہ نہ تھا۔ میں نے بہت سر مارا۔ لیکن اُس لڑکی کا جسکی میں نے صورت تک نہیں دیکھی تھی نشان تک نہ ملا۔ تھک کر کلکتہ چلا آیا اور میں نے تہیہ کرلیا کہ حتی الامکان اب شادی نہیں کروں گا۔ میرے دل پر بہت دنوں ایک بوجھ سا رہا۔ مگر تمہاری ملاقات میری زندگی ایک نئے ولولے سے معمور ہوگئی اور بالآخر مجھے اپنے ارادہ سے واپس ہونا پڑا"۔ شیام نرائن نے کنول کی صورت دیکھی تو پریشان ہوگیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا وہ زار وقطار رو رہی تھی۔ اُس نے کہا۔ خیر تو ہے تم اسقدر پریشان کیوں ہوگئیں۔ کنول نے اس خیال سے

کہ شیام نرائن کو کوئی شبہ نہ ہو جائے کہ ٹال دیا۔ "طبیعت آج مضمحل تھی ہی۔ تمہارے افسانہ نے بڑا اثر کیا" حقیقت یہ تھی کہ کنول یہ معلوم کر کے سراسیمہ ہو گئی کہ شیام نرائن کی کھوئی ہوئی بیوی جسے وہ مردہ تصور کر چکا ہے کسوم ہے۔ اور کسوم جو پڑی ہوئی شیام نرائن کی باتیں سن رہی تھی یہ معلوم کر کے ایک سکتہ میں آ گئی کہ اس کا اصل شوہر شیام نرائن ہے۔

---

نیرنگ کدہ ہستی کا یہ دوسرا کھیل تھا اور کسوم میں اتنا دم باقی نہ رہ گیا تھا کہ وہ اس کے کھیلنے کی تاب لاتی۔ اس زہر آلود بھول بھلیاں سے وہ گھبرا اٹھی تھی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ اس کشمکش سے آزاد ہونے کے لئے اسکی روح سخت بیتاب ہے اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ زمانہ نے اس کو اس قابل نہ رکھا تھا کہ شیام نرائن کی ہمدم بننے کی وہ جرات کرتی۔ اس کو اس کا قلق تھا کہ اس نے اپنے واقعات کیوں کنول کے گوشگذار کر دئے۔ وہ ایک غیر معلوم حالت میں جان دینا چاہتی تھی۔ ممکن تھا کہ اگر کنول سے اس نے یہ حال نہ کہا ہوتا تو ماتا جی کی زندگی تک کم از کم وہ وہاں سے علیحدہ ہونے کی کوشش نہ کرتی۔ اور یہ سوچکر کلیجہ پر صبر کی سل رکھ لیتی۔ کہ گرچہ اس کا شوہر اس کی دسترس سے باہر ہے لیکن قسمت نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے لیکن اب صورت حال دگرگوں تھی۔ وہ کنول کی فطرت سے واقف تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب کنول اس سے کنول ہو کر نہ ملے گی۔ بلکہ شیام نرائن کی بی بی اور اس کی رقیب ہو کر اور پھر معلوم نہیں وہ کیا کرے؟ اور اس کا اثر کسوم کی زندگی پر کیا ہو؟ اس جانسوز کشمکش میں کسوم نے تارے گن گن کر رات گذار دی۔ صبح ہوئی تو اسکے چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔

کنول کی حالت نازک تھی۔ وہ شیام نرائن سے بخوشی دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن اس خیال سے کہ کسوم کے ہوتے ہوئے اسے شیام نرائن پر کوئی حق حاصل نہیں ہے لرز جاتی۔

تین روز ہو گئے اور کنول شیام نرائن کے مکان پر نہ آئی۔ شیام نرائن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی۔ تیسرے روز وہ کنول کے پاس خود گیا۔ کنول کے برتاؤ میں کوئی خاص فرق نہ تھا ہاں وہ ایک حد تک مضمحل ضرور تھی۔ دو تین ٹہلنے گئے۔ تو شیام نرائن نے جو ایک خاص بات محسوس کی وہ کنول کی نگاہوں کا سنجیدہ استفسار تھا۔

صبح سے کاتی کا سالانہ اشنان شروع ہونیوالا تھا۔ ماتا جی بہت خوش تھیں۔ کیونکہ اس کے بعد شیام نرائن دولھا بننے والا تھا۔ وہ نہایت سرگرمی سے شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ کسوم بھی کلیجہ پر پتھر رکھکر ان کے ساتھ کاموں میں مشغول تھی۔ اس کا مستقبل صرف خوفناک طور پر تاریک ہی نہیں بلکہ حد درجہ متوحش کن تھا۔ برداشت کی تمام طاقتیں اس کی سلب ہو چکی تھیں۔ اسکی وہی کیفیت تھی۔ جیسے کوئی انتہائے رنج میں بالکل بے حس ہو جائے۔ فطری طور پر ایسی حالت میں اس کا طرز عمل قطعی غیر ارادی تھا۔ ماتا جی کسوم کی اس کیفیت سے متاثر ضرور تھیں لیکن ان کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی۔

ماتا جی نے کسوم اور شیام نرائن سے کہدیا تھا کہ سویرے سو رہیں۔ کیونکہ اشنان کے لئے رات رہے

اُٹھنا پڑے گا۔ کسوم پلنگ پر پڑی اپنی مصیبت کی گھڑیاں گن رہی تھی کہ ماتا جی نے اس سے پکار کر کہا کہ گھاٹ جانے کا وقت ہو گیا ہے۔

---

گاڑی میں اتفاق سے ایک طرف ماتا جی اور خادمہ بیٹھ گئی۔ دوسری طرف شیام نرائن اور مجبوراً کسوم کو ساتھ بیٹھنا پڑا۔ اسوقت کسوم کا اضطرار اُس کے لئے ہلاک کن ثابت ہو رہا تھا۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ گاڑی کسی چیز سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے اور وہ اس مجبوری سے نجات پائے۔ گاڑی چلتے چلتے ہچکولے لیتی اور شیام نرائن کا بدن کسوم سے مس ہوتا جس سے کسوم کے تمام بدن میں ایک جانسوز سنسنی پیدا ہونے لگتی۔ گاڑی کے اندر اندھیرا تھا۔ شیام نرائن ایک بار اُٹھا تاکہ سر نکال کر دیکھے کہ گھاٹ کتنی دور رہ گیا ہے۔ اُٹھتے وقت اتفاق سے اس نے اپنا ہاتھ کسوم کے شانوں پر رکھدیا۔ کسوم کے حسیات کی ہلچل آخری درجہ تک پہونچ گئی۔

گاڑی گھاٹ پر پہنچ گئی۔ برج نرائن اور کنول پہلے سے منتظر تھے۔ کسوم کنول سے آنکھ چار کرتے ہی اس طرح زرد پڑ گئی کہ اسکو چھپانے کے لئے تمام طاقت صرف کرنی پڑی۔ کنول بھی کسوم کو دیکھکر بے اختیار جھجک سی گئی۔

گھاٹ پر بہت ہجوم تھا۔ ملک کے ہر حصہ سے لوگ اس مقدس دریا کے کنارے اور خاص کر اس موقعہ پر جب اسکی برکت دونی ہو جاتی ہے اپنے گناہ دہوتے آتے ہیں۔ آفتاب نکلنے سے پہلے یہ لوگ اشنان سے فارغ ہو کر گھر واپس ہو گئے اشنان کے بعد باوجود انکار کے کسوم کو وہی ساری پہننی پڑی جو ماتا جی نے اُس کے لئے اُسی روز کے واسطے تیار کی تھی۔ کسوم مضمحل ضرور تھی۔ لیکن اس کے اس اضمحلال میں بھی ایک غیر معلوم لطافت ایک غیر محسوس کیف تھا۔ اس کا ارغوانی رنگ ایک حد تک زعفران کی رنگت لئے ہوئے تھا۔ اس کی عنابی ساری کا عکس اس کے چہرے کی سپیدی سے مل مل کر خاص کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ اس کی پلکیں قدرتی طور پر بہت لانبی تھیں۔ لیکن آج انتہائے رنج سے وہ ان کو اس طرح جھکائے تھی۔ کہ بات کرتے وقت بھی اس کی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتیں۔

اشنان سے واپسی میں کئی مرتبہ شیام نرائن کی آنکھیں کسوم سے چار ہو گئیں۔ کسوم تو عرق عرق ہو جاتی۔ لیکن شیام نرائن ہکا بکا ہو کر رہجاتا۔

گھاٹ سے واپس ہوتے ہی ماتا جی کو خفیف سی حرارت ہو گئی اور شام تک ان کو کافی تیز بخار ہو گیا۔ صبح تک بخار اسقدر بڑھ گیا کہ شیام نرائن گھبرا گیا۔ اور یہ معلوم کر کے بہت پریشان ہوا کہ انکو مہلک قسم کا بخار آگیا ہے۔

ماتا جی کی حالت نازک ہوتی گئی۔ کسوم کا کلیجہ اس درد سے پھٹا جا رہا تھا کہ زندگی بھر میں اس کو ایک ہمدرد ملا تھا۔ اُسے بھی قدرت اُس سے چھینا چاہتی ہے۔ وہ انتہائے خلوص انہماک سے ماتا جی کی تیمارداری میں مشغول تھی۔ رات رات بھر پلنگ سے سر لگائے یہ دیکھتی رہتی کہ خدانخواستہ ماتا جی کا دم تو نہیں ٹوٹ رہا ہے۔ لیکن اسکے

باوجود اسکے گھر کا کام جو تمام اُسکی ذمہ داری پر تھا اس قرینہ اور جانفشانی سے کرتی رہی کہ ماتاجی کی علالت سے گھر کے کام کاج میں رتی بھر کا فرق نہ آیا۔ دن رات میں شاید وہ کسی وقت آرام نہ کرتی تھی۔ کسوم واقعہ یہ ہے کہ ایک ہندوستانی بیوی کی صحیح مثال پیش کر رہی تھی۔ شیام نرائن سے نہ رہا گیا وہ ایک دن اُس نے کہا:۔ "کسوم تم کسی وقت آرام نہیں کرتیں اگر خدانخواستہ تمھاری بھی طبیعت ناساز ہو گئی تو پھر کیا ہوگا؟" کسوم خاموش رہی۔ کنول کسوم کی جانفشانیوں کی داد دل سے دے رہی تھی۔ اسکو یہ معلوم ہو گیا کہ صرف تعلیم و معاشری تہذیب انسان کا کمال نہیں۔ بلکہ وہ چیز جو انسان کو تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اس کا دردِ دل اور بے غرضی ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو کسوم سے بہت پیچھے پاتی وہ کسوم کو ایک معصوم اور درد بھرا فرشتہ خیال کرنے لگی اور اس کی حق تلفی کے خیال سے اس کو جانکنی سی ہونے لگتی۔

ایک شام کنول ماتاجی کو دیکھنے آئی۔ ماتاجی پر ایک نیم غشی کی کیفیت طاری تھی۔ کسوم پلنگ کے پاس بیٹھی تھی۔ کنول کو آتا دیکھکر نہایت خندہ پیشانی سے بلا کر اپنے قریب بٹھلایا۔ کسوم واقعی ماتاجی کی بیماری میں اسدرجہ منہمک تھی کہ وہ اپنی رسوائیاں ایک حد تک بھول گئی تھی۔ لیکن کنول کو دیکھکر وہ پھر تازہ ہو جاتیں۔ مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ کنول کی جانب سے رقابت کا خیال اس کے دل میں بغض کا خیال پیدا کرتا ہو۔ وہ ان منزلوں سے اپنے خیال میں گذر چکی تھی۔ اس نے کنول کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا:۔ "کنول اب تم یہاں آتے آنا کیوں اسقدر کم کر دیا۔ اسوقت جب ماتاجی کی حالت نازک ہے سخت نگہبانی کی ضرورت ہے۔ اور میں اپنی جہالت سے بجائے کام بنانے کے بگاڑ دیتی ہوں۔ کیا کسوم کی پابندی میں تم ابھی اس گھر سے اجنبیت قائم رکھنا چاہتی ہو"۔

وہ کسوم کی اس قربانی پر جسے وہ ہنس ہنس کر کر رہی تھی تصویرِ حیرت ہو کر رہ گئی۔ کسوم کے منھ سے وہ اسٹونسن اور گوئٹے کا فلسفہ سُن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس کے فطری جذبات کسقدر پاکیزہ ہیں۔ کسوم کی یہ خوبیاں کنول کی زندگی کے نئے اوراق اُلٹ رہی تھیں۔ اور اُسے یقین ہو گیا کہ کسوم کے جائز حق پر قابو پاکر وہ کبھی خوشی کا ایک سانس نہیں لے سکتی۔ اور جب کسوم نے پھر چھیڑنے کی غرض سے کہا کہ کاش ماتاجی اُسوقت بیمار پڑتیں جب تم اس گھر میں مستقل طور پر آجاتیں۔ تو کنول اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کا چہرہ اُس کے اندرونی جوش سے سُرخ ہو رہا تھا۔ "کسوم! میں غاصب ہو کر اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ تمکو خدا تمہارا گھر مبارک کرے۔ تمکو معلوم ہے کہ تم شیام نرائن کی کھوئی ہوئی بیوی کسوم ہو"۔ یہ تھے وہ الفاظ جو کنول کانپتی ہوئی آواز سے ادا کر کے کسوم کو ایک ساکت بت کی طرح چھوڑ کر چلی گئی۔

شیام نرائن کے مکان سے نکلکر کنول نے سواری کا انتظار نہ کیا اور پیدل ساحل کی سڑک سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ وہ اس بات پر خوش تھی کہ اُس نے ایک بوجھ اپنے ضمیر سے اُتار دیا۔ یکایک اُس کے قریب ایک گاڑی آکر رکی۔ اُس نے جو سر اُٹھا کر دیکھا تو ششدر رہ گئی۔ راج کشور اس گاڑی پر تنہا بیٹھا تھا۔ اُس نے بلا کسی تصنع کے کنول سے کہا:۔ "اگر کوئی حرج نہ ہو تو گاڑی پر آجایئے۔ میں آپ کو گھر پہنچا دوں"۔ کنول ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ وہ بغیر کسی رد کے

کے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اور کچھ دیر تک اس کو یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ وہ کہاں ہے؟ اور کس ماحول میں ہے؟ آخر راج کشور بولا:۔ "کنول تم اسقدر مجھ سے اجنبی کیوں ہو گئیں۔ اگر تم کو میرے قصور کا علم ہے تو یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں کسقدر مجبور اور بے بس تھا۔ خیر! گذری ہوئی باتوں کو جانے دو۔ میں نے تم کو کسوم اور ڈاکٹر شیام نرائن صاحب کے ساتھ گھاٹ پر اشنان کے پہلے روز دیکھا تھا۔ میں نے اپنی موجودگی کا علم تم کو اس لئے نہیں ہونے دیا کہ میں تمہارے پُر سرور لمحات کو تلخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ تاریخ تو مقرر ہو چکی تھی اب تک شادی کیوں نہیں ہوئی؟" کنول اب اپنے ہوش میں آ گئی تھی۔ وہ راج کشور کی اس بے تعلقی اور استقلال پر متعجب تھی۔ جس بات سے اُسکے دل کو ایک حرکت ہوئی وہ یہ تھی کہ راج کشور زرد اور نہایت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کی حالت دیکھکر کسوم نے آسانی سے سمجھ لیا کہ اس کو دق ہو گئی ہے۔ وہ اپنی تمام طاقتوں کو جمع کر کے بولی:۔ "ڈاکٹر صاحب سے اس لئے شادی نہیں ہو سکتی کہ ان کی بیوی موجود ہے۔ گرچہ ابھی اس کا علم ان کو نہیں۔ لیکن میں اس حق تلفی کو گوارا نہیں کرونگی!"

راج کشور کچھ دیر کے لئے ساکت ہو گیا۔ گرم گرم آنسوؤں کے قطرہ کنول کے ہاتھ پر گرے، وہ چونک پڑی اور حسرت سے راج کشور کی صورت دیکھنے لگی۔ راج کشور نے کہا "اور ڈاکٹر کی اصلی بیوی کسوم ہے؟" کنول نے سر ہلایا۔ اتنے میں راج کشور کا مکان آ گیا وہ اُتر پڑا اور گاڑی والے سے یہ ہدایت کر کے کہ کنول کو اُس کے مکان پہنچا دے۔ کنول سے خدا حافظ کہتا ہوا چھڑی کا سہارا لیتا ہوا مکان کے اندر چلا گیا۔

اس واقعہ کو دو ہفتہ گذر گئے ہیں۔ ماتا جی اچھی ہو گئی ہیں۔ ضعف باقی رہ گیا ہے۔ ان کو کسوم سے پہلے جو انہماک تھا وہ ایک مستقل محبت مادرانہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اور جس خلوص سے اب بھی کسوم اُن کی ضروریات کا خیال رکھتی تھی اُس پر بعض وقت ماتا جی کو شرم آنے لگتی۔

شیام نرائن کو کنول کی ان دنوں کی بے تعلقی بہت گراں گذری تھی۔ وہ دو ہفتہ سے ماتا جی کو دیکھنے نہیں آئی تھی۔ شام کے وقت شیام نرائن کمرہ میں بیٹھا اس مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ کہ ایک ایسی لڑکی جو دور سے اس قدر بیگانہ ہو کیونکر اُس کو خوش رکھ سکتی ہے۔ یکایک دروازہ کھلا اور کنول خاموش آ کر بیٹھ گئی۔ شیام نرائن نے رسمی مزاج پرسی کی۔ کنول نے کہا زندہ ہوں۔ اور پھر نہایت سنجیدگی سے ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کیا:۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کو میری ان دنوں کی کج خلقی بہت ناگوار گذر رہی ہو گی۔ لیکن واقعات کی بناء پر مجبور تھی۔ بات یہ ہے کہ آپ کی جائز بیوی کی موجودگی میں جسکا آپ کو علم نہیں مجھے آپ سے کسی ایسے قسم کی امید وابستہ کرنا میری ایک دنائت ہوتی۔ اور اُس نے کسوم کی پوری سرگذشت شروع سے آخر تک حرف بحرف سُنا دی۔ اس سلسلہ میں اُس نے نہایت صفائی سے اپنا اور راج کشور کا تعلق بھی بیان کر دیا۔ اور وہ یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی کہ اپنی کج خلقی سے جو واقعی فطرت سے مجھ میں ودیعت ہوئی ہے آپ میں اپنی طرف سے اسلئے برہمی پیدا کر رہی تھی کہ آپ اس واقعہ کے سننے کے لئے تیار ہو جائیں۔ آپ کی چونکہ میں دل سے عزت

کرتی ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ آپ کو میرے چھٹنے کا زیادہ غم ہو اور اپنی قابل پرستش فرشتہ خصلت بیوی کے واپس ملنے کی آپ کو خوشی نہ ہو۔ میں نے کسوم کو بھی حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے۔"

شیام نرائن انتہائی سنجیدگی سے شروع سے لیکر آخر تک بیٹھا رہا۔ اپنے اوپر اُس نے اسقدر قابو رکھا کہ کنول کو دیکھکر تعجب ہوا۔ کنول کے چلے جانیکے بعد شیام نرائن نے اپنا سر میز پر ڈالدیا اور دو گھنٹہ اسی طرح معلوم نہیں کن استغراق میں پڑا رہا۔ وہ اُٹھا تو اُس کا تمام جسم اسطرح پسینہ سے بھیگا تھا۔ جیسے کسی نے گھڑوں پانی ڈالدیا ہو۔ وہ نہاکر سیدھا اندر گیا۔ اور کھانے کے لئے کمرہ میں چلا گیا۔ اتفاق سے کام کرنیوالی اُس روز سویرے چلی گئی تھی۔ ناچار کھانا کسوم ہی کو لانا پڑا۔ کھانا لیکر وہ شیام نرائن کے سامنے آئی۔ لیکن اس طرح کہ مجسم ارتعاش تھی۔

شیام نرائن نے اُسکی اس کیفیت کو دیکھا اور جب وہ کھانا رکھکر واپس ہو رہی تھی تو شیام نرائن اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا:۔ "کسوم مجھ سے کیسی شرم؟" کسوم پر جیسی بجلی گر گئی ہو۔ وہ سمجھ گئی کہ کنول نے تمام حال شیام نرائن سے کہدیا۔ اور کانپ کر فرش پر گر گئی۔

کسوم کو جب ہوش آیا تو اُس نے دیکھا کہ اس کا سر شیام نرائن کی آغوش میں ہے۔ کسوم نے یہ کہکر اُٹھنے کی کوشش کی کہ "مجھے چھوڑ دو میرا ماضی بہت سیاہ ہے۔" لیکن اُسے اُٹھنے نہیں دیا گیا۔ "تاریک ماضی کو بھول جاؤ۔ تم بالکل بے قصور ہو۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ تم مجسمہ ہو معصومیت کی۔" کسوم نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی اور کہنا چاہا لیکن نہ تو وہ اُٹھ پائی اور نہ کچھ کہہ پائی۔ اُسکے منہ پر شیام نرائن نے مہر لگادی اور کسوم عرق عرق ہو گئی۔

---

راج کشور کی حالت کلکتہ میں روز بروز خراب ہوتی گئی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ کسی دریا کے قریب کچھ دنوں کے لئے چلے جاؤ۔ راج کشور نے بنارس کو منتخب کیا۔ وہ اپنے ضمیر کی شب دروزگی نفرین سے عاجز ہو کر مذہب کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ اوس نے سمجھا کہ شاید اس مقدس مقام کی برکت سے اس کا جی ہلکا ہو جائے گا۔ اور موت جس کو وہ سمجھ رہا تھا کہ دور نہیں ہے ایسے وقت آئے گی۔ جب اُس کی اندرونی کلفتیں محو ہو چکی ہوں گی۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ معصوم اور شریف کسوم کے دل دکھانے سے یہ سب آفتیں اس پر آئی ہیں۔ اب وہ کسوم کے خیال کی دل سے عزت کرتا۔ اس کا وہ اسطرح احترام کرتا جیسے کسی دیوی کا۔ جہانتک ممکن ہو وہ کسوم کے خیال کو دل میں نہ آنے دیتا۔ ہاں اتنی تمنا ضرور تھی کہ اگر کسوم مل جائے تو اُس کے قدم چوم کر اُس سے معافی کی آرزو کرے۔ لیکن کنول کا خیال۔ اس کو وہ اپنے دل سے نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ روز بروز اور مستحکم ہوتا گیا۔ لیکن اب اس سوز و گداز کو وہ مادیات کی تنگ اور کثیف حدود سے بالاتر لیجانا چاہتا تھا۔ اس حدتک کہ کنول کے خیال کو کنول کی شخصیت سے کوئی تعلق نہ رہے۔ اور اسکی پرستش وہ اس پاک مندر میں کرے جہاں کائنات کی کسی شے اور کسی دوسرے خیال کا گذر نہ ہو۔

اُس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ کنول اسکو اب کس حیثیت میں ملیگی۔ لیکن اب اس کو اس سے ملنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کنول کی وہ پرستش صرف اسلئے کرتا تھا کہ وہ کنول تھی۔

وہ صد درجہ لاغر ہو گیا تھا۔ اسے تپ بھی رہنے لگی۔ ڈاکٹروں نے اسکے خیال کے مطابق اسکو دق بتلا دیا۔ اور یہ کہا کہ کسی اندرونی صدمہ کیوجہ سے اسکی یہ حالت ہو گئی ہے۔ حقیقت کو خوش رکھنے کی کوشش بہت ضروری ہے۔ لیکن راج کشور کا یہ ایمان تھا کہ کوئی طاقت اسکو کنول کے خیال سے جدا نہیں کر سکتی۔ بنارس آکر اُس نے شیام نرائن کا علاج یونہی لوگوں کے کہنے سے شروع کر دیا۔ وہاں کنول کے متعلق اسکو سب کچھ معلوم ہو گیا۔ لیکن وہ ہمیشہ محتاط رہا کہ اسکا قدم نہ پھسلے۔ اور اس خیال سے کہ شاید کنول سے ملاقات ہو جائے اور پھر معلوم نہیں کیا ہو۔ اُس نے ڈاکٹر شیام نرائن کے مطب میں آنا چھوڑ دیا جب ضرورت ہوتی تو خود انکو اپنے یہاں بلا لیتا۔ اُس نے اشنان کے روز کنول کو دیکھا۔ لیکن کسوم کو دیکھکر کنول کے دیکھنے کی تمام مسرتیں پامال ہو گئیں۔ اپنی تمام روحانیت کو وہ سیاہ تصور کرنے لگا۔ اس نے یہ خیال کیا کہ ایک معصوم زندگی کے برباد کرنیکا وہ ذمہ دار ہے۔ اور یہ ایسا داغ ہے جو مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ اس کے بعد سے اسکی حالت ابتر ہوتی گئی۔ اتفاق سے جو کنول سے ملاقات ہو گئی تو گرچہ اُسکے سامنے اُس نے بلا کا استقلال دکھلایا۔ لیکن اس کے بعد اسکے باقی ماندہ خون کے قطرے بھی نہایت تیزی سے جل کر سوکھنے لگے۔ اس خیال سے ایک قسم کا اطمینان ہو گیا تھا کہ کنول کا دامن ایک ایسے شخص کے ساتھ باندھ دیا جانیوالا ہے۔ جس کے بعد وہ اُس سے قریب تر ہونے کی کوشش کرے گا بھی تو بیکار۔ لیکن اب جو اُس نے سنا کہ صورت حال یوں ہے تو اُسکی بے تابیاں پھر بڑھ گئیں۔ ہاں اس خیال سے اُسے ضرور سکون ہوتا تھا کہ کسوم کی زندگی اب شاید ٹھکانے لگ جائے۔

دوسرے روز شام کو شیام نرائن جو راج کشور کو دیکھنے آیا تو اُس کے انداز میں کچھ ایسا تغیر تھا کہ راجکشور سمجھ گیا کہ کنول نے تمام واقعات اس سے کہدئے ہیں۔ شیام نرائن جب واپس جانے لگا تو راج کشور نے اپنے قریب بٹھلا کر اُس سے کہا: "ڈاکٹر صاحب یہ تو جناب کو معلوم ہے کہ میں چند دنوں کا مہمان ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کسی وقت اپنے ساتھ کسوم کو لیتے آویں۔ شیام نرائن کچھ دیر خاموش رہا اور پھر یہ کہکر چلا گیا کہ آپ اطمینان رکھئے میں کل اپنے ساتھ کسوم کو ضرور لیتا آؤں گا۔

---

دوسرے روز شیام نرائن کسوم کو لیکر راج کشور کے مکان گیا۔ کسوم سے اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ راستہ میں اُس نے پوچھا تو کہدیا کہ تم کو ایک ایسی جگہ لے چل رہا ہوں جہاں تم کو تعجب اور خوشی دونوں ہو گی۔ راج کشور پلنگ پر پڑا ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ شیام نرائن کسوم کو اپنے بازو میں لئے کمرہ میں داخل ہوا اور کسوم کو راج کشور نے سامنے چھوڑ کر خود آہستہ سے باہر چلا گیا۔ کسوم نے جو سامنے راج کشور کو دیکھا تو یہ محسوس کیا کہ اُس کا تمام جسم پتھر کا ہوا

جا رہا ہے۔ راج کشور بہت نحیف ہو گیا تھا۔ اور اس وقت اسکو تیز تپ چڑھی ہوئی تھی۔ تمام قوت یکجا کرکے وہ اُٹھا اور کسوم کے سامنے دوزانو ہو کر سر اُس کے پاؤں پر ڈال دیا۔ کسوم نے اب محسوس کیا کہ وہ ہنوز پتھر کی نہیں ہوئی۔ راج کشور کی ہچکی بندھی تھی آواز پر قابو پا کر بولا۔ "کسوم! کیا تم مجھے کبھی نہیں معاف کر سکتیں۔ دیکھو اپنے کئے کی سزا بہت اچھی طرح پا رہا ہوں۔ میرا وقت آچکا ہے۔ میں چند دنوں یا چند گھنٹوں کا مہمان ہوں۔ کسوم! کیا تمہارا معصوم دل یہ گوارا کرے گا کہ میں اسی طرح پھنکتا سسکتا جان دوں۔ کیا مجھے معاف کرکے تم اس سکون کو جسے میں کھو چکا ہوں واپس نہ بخشوگی۔ کسوم میں موت کا بہت خوشی سے خیر مقدم کرونگا۔ اگر یہ اطمینان ہو جائے کہ تمہارے دل کو خون کرنے کا مواخذہ مجھ سے نہ ہوگا۔ للہ کسوم بولو۔"

کسوم کا دل درد آشنا تھا۔ وہ بے التفاقی جانتی ہی نہ تھی۔ راج کشور کی یہ بے لبسی اور اُس کی قابل رحم حالت دیکھ کر بلبلا کر رونے لگی۔ اور بولی:۔

"راج کشور بابو آپ مجھے کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ آپ قطعی بے خطا ہیں۔ اگر آپ کی کوئی غلطی تھی بھی تو اسکا اب کوئی ذکر نہیں کیونکہ خدا نے وہ دن گذار دئے۔ آپ اس قدر مایوس کیوں ہوتے ہیں۔ اگر آپ کی تشفی اتنے سے نہیں ہوتی تو میں اپنے پیدا کرنیوالے کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اگر آپ سے کوئی غلطی ہوئی بھی تو میں نہایت صاف دل سے معاف کرتی ہوں۔ اور وہ بھی معاف کرے۔"

راج کشور کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ "کسوم! مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی۔" یہ کہکر اُس نے پہلے کسوم کے پاؤں پھر ہاتھوں کا بوسہ لیا۔ اور شیام نرائن کو اندر آنیکی آواز دی۔

"ڈاکٹر صاحب آپ کو کسوم جیسی بیوی پر فخر کرنا چاہئیے۔ یہ زمانہ کی بہت ستائی ہیں۔ آپ انکی قدر خود پہچان گئے ہوں گے۔ اس لحاظ سے آپ ان کی جتنی بھی دلداری کیجئے کم ہے۔" راج کشور اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ دروازہ کھلا اور کنول اور برج نرائن بابو داخل ہوئے۔ برج نرائن بابو اندر آتے ہی بول اُٹھے "کیوں راج کشور تم اتنے دنوں سے بنارس میں ہو لیکن تم نے ہملوگوں کو بیخبر رکھا۔"

راج کشور نے پہلے ان کا مزاج پوچھا اور کہا "کہ غلطی تو ضرور ہوئی لیکن میں سمجھ چکا تھا کہ میں ان منزلوں سے گذر چکا ہوں۔ جہاں کسی قسم کی تیمارداری مفید ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں آپ لوگوں کو پریشان کرنا فضول تھا۔" "نہیں تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔" برج نرائن بابو نے کرسی قریب کرتے ہوئے کہا اور شام تک راج کشور کو سب لوگ تسلی تشفی دیتے رہے۔ راج کشور بالکل خاموش بیٹھا اُن لوگوں کی باتیں سُن رہا تھا۔ مغرب کے بعد سب لوگ واپس گئے۔

راج کشور کی حالت رات کے پچھلے پہر سے بہت بگڑنے لگی۔ صبح ہوتے ہوتے اُس کے نوکر نے کنول کے مکان پر پہونچکر آواز دی۔ کنول سو رہی تھی۔ دروازہ کھولا۔ آدمی نے کہا کہ راج کشور صاحب کا آخری وقت ہے۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کنول بالکل اسی حالت میں اس کے ساتھ ہو گئی۔ پہونچی تو واقعی راج کشور دم توڑ رہا تھا۔ کنول کو دیکھتے ہی ایک برقی طاقت نے

آخری مرتبہ اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا کردی۔ بولا "پیاری..... کنول..... تم آگئیں"۔ کنول کی ہچکی بندھ گئی۔ لیکن قبل اس کے کہ راج کشور آخری سانس لیتا۔ آپس میں کچھ آہستہ آہستہ باتیں ہوئیں۔ کنول پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اور راج کشور کی جان اس حالت میں نکلی کہ کنول کا سر اُس کے سینہ پر تھا۔

عجیب حسرتناک موت تھی۔ دوپہر تک لاش گھاٹ پر لائی گئی۔ کسوم شیام نرائن و برج نرائن بھی ساتھ تھے مذہبی رسمیں ادا ہوئیں۔ اب آخری منزل یعنی لاش کو جلانا باقی رہ گیا۔ اور اس سوال پر کہ آگ پہلے کون دے۔ کنول آگے بڑھی اس طرح کہ اُسکے لمبے لمبے بال کھلے تھے۔ خوبصورت پاؤں میں برہنہ تھے پیاری پیاری آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو نہایت فراوانی سے بہہ بہہ کر اُس کے خشک رخساروں کو دھو رہے تھے۔ شیام نرائن نے کہا: "کسوم تم کو بھی آگ دینا چاہیئے" کسوم بھی آہستہ سے آگے آئی۔ اور ان دونوں لڑکیوں نے ایک ساتھ آگ دی۔ اس طرح کہ کسوم اضمحلال مجسم تھی اور کنول یکسر پیکر اضطراب۔

(ماخوذ از ٹیگور)

عبد السلام فاروقی بی۔ اے

---


# طیار ہے

## نگارستان
(جدید اڈیشن معہ کچھ اضافہ کے)

علاوہ محصول (عہ)　　مینجر "نگار"

## شہاب کی سرگزشت
(نہایت خوبصورت جدید ایڈیشن)

علاوہ محصول (عہ)　　مینجر "نگار"

---

## موج تبسم

مُلک کے مشہور مزاح نویس

شوکت تھانوی

کے مضامین کا دلکش مجموعہ زریں جلد۔ معہ محصول (عہ)

مینجر "نگار"

## فلسفۂ مذہب

مولوی سید مقبول احمد صاحب بی اے کی وہ معرکتہ الآرا تصنیف جسنے تمام ملک کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے۔

معہ محصول (عہ)

مینجر "نگار"

# خواجہ آتش کے متعلق کچھ جدید تحقیق و تفتیش

## بسلسلہ ماسبق

اب وجوہ تشیع کے جوابات سنئے۔

۱۔ آزاد کی پہلی روایت کا حال یہ ہے کہ (الف) آتش کے ایک ہی لڑکا تھا۔ خواجہ محمد علی جوش نامی، کوئی لڑکی نہ تھی۔ (آب بقا صفحہ ۱۱ اور گل رعنا صفحہ ۳۶۰)

۲۔ آتش کی بیوی آتش کی زندگی ہی میں مرگئی تھی۔ آب بقا صفحہ ۱۳ پر ہے کہ جب آتش نابینا ہو گئے تو محمد علی جوش کی شادی ایک باہمت ہندو شاگرد کے اصرار اور خرچ سے آتش نے کی۔ جوش سہرا پہن کر آتش کے پاس گئے تو آتش رو دئے۔ لوگوں نے کہا: "اس وقت آپ روتے کیوں ہیں؟" کہنے لگے "اس کی ماں مرگئی ورنہ وہ اس کو سہرا پہنے دیکھ کر خوش ہوتی۔ میں نابینا ہوں دیکھ نہیں سکتا"۔

۳۔ آتش کی وفات کے وقت اُن کا بیٹا جوش شادی شدہ جوان تھا نہ کہ خردسال۔ (گل رعنا صفحہ ۳۶۰: بیوی کے مرنے کے بعد آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔)

دیکھیے آزاد نے ایک سانس میں کتنے جھوٹ بولے۔ بیوی اور بیٹی کا بعد وفات آتش کا زندہ رہنا غلط۔ لڑکے کا خرد سال ہونا غلط۔ جس فقرہ میں اتنی باتیں خلاف واقعہ ہوں تو کیونکر اُس کے اس حصہ کو صحیح مانا جاسکتا ہے کہ ایک شیعہ نے آتش کی تجہیز و تکفین کی اور اس سے ان کی موت پر شیعی موت کا اطلاق ہو سکے۔ کیونکہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ ایک جوان بیٹے نے تجہیز و تکفین نہ کی ہو بلکہ ایک غیر نے کی ہو۔

۴۔ آب بقا میں صفحہ ۱۳ پر خلیل کی سعادتمندی کا ذکر ضرور ان الفاظ میں ہے کہ "آخر وقت میں آتش کی بینائی جاتی رہی تھی۔ میر دوست علی خلیل ان کی خدمت کرتے تھے۔" اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس نے شیعی تجہیز و تکفین بھی کی ہو۔ بات فقط اتنی ہی تھی کہ خلیل نے آتش کی زندگی اور بڑھاپے میں خدمت کی۔ آزاد نے اس پر اتنا حاشیہ چڑھا کر یہ افسانہ بنا دیا۔

۵۔ آب بقا میں ناسخ کا مذہب۔ انکی قبر کی شکل (کہ وہ حسب دستور اہل تشیع زمین سے ملی ہوئی ہے) تو درج ہے مگر آتش کے بارہ میں کچھ درج نہیں۔ سوا اس کے کہ گھر ہی میں دفن ہوئے۔

۲- میر انیس کی روایت = راوی کا نام پڑھ کر ناظرین شاید مرعوب ہو جائیں اور آزاد کی چال بھی یہی تھی بقول غالب

غازیاں ہمرہِ خویش آورد از بہر جہاد ✲ تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ ہست

لیکن میر انیس کی شہرت و عظمت صرف مرثیہ گوئی کی بنا پر ہے روایت۔ ثقاہت۔ تاریخ میں تو ان کا کوئی پایہ نہیں۔ ان حیثیتوں سے وہ ایک عام شخص تھے۔ اب روایت پر تھوڑی ہی سی درایت کی نظر ڈالنے سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا میر انیس کی اس روایت کا وجود آب حیات سے باہر بھی کہیں ہے؟ جواب نفی میں ہوگا۔

آتش کے خاندان میں تسنن اور تصوف متوارث تھا اور اباً عن جدٍ پیری مریدی کا طریقہ چلا آتا تھا۔ خود آتش اُس باپ کی گود میں پلا تھا جس کی بابت سب تذکرہ نویس متفق اللفظ ہیں کہ فقیر سالک تھا۔ پھر باپ کے انتقال کے وقت تک آتش اپنے باپ کے ساتھ رہے۔ اور باپ اُسوقت مرا ہے جب "آتش ابھی اچھی طرح جوان نہیں ہونے پائے تھے اور تعلیم نامکمل تھی"۔

کیوں صاحب! وہ کونسا مسلمانوں کا اور خاصکر درویشوں کا گھرانہ ہوگا جس کا بچہ بچپن سے اپنے بزرگوں کو نمازیں پڑھتے نہ دیکھے گا؟ اور اس کو نماز نہ سکھائی جائے گی؟ اور اچھی طرح جوان ہونے کی عمر تک بھی وہ جانے گا کہ ہم شیعہ ہیں یا سنی۔ اور شیعوں کے ہاں ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہیں۔ اور سنیوں کے ہاں ہاتھ باندھ کر؟ خود ہمارے گھر میں ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی جاتی ہے یا ہاتھ کھول کر؟ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ لڑکا آوارہ ہو تو خود نماز کا پابند نہ ہو۔ لیکن ہر مسلم کا بچہ نماز کی ہیئت اور دونوں نمازوں کا فرق جانتا ہے۔

۳- کیا آپ ایسے شیعہ کا تصور کر سکتے ہیں کہ عقائد سے تو اتنا باخبر ہو کہ بقول اثر صاحب یہ مصرعہ کہہ جائے کہ:-

شیطان کے نطفہ سے ہے وہ ناخلف یدل

لیکن اعمال سے اتنا ناواقف ہو کہ دونوں نمازوں کا فرق جانے نہ شیعہ نماز اُسکو آئے؟

(۴) لکھنؤ میں آتش و ناسخ کا زمانہ، شیعیت اور مذہبیت کے سخت جوش کا زمانہ تھا۔ ناسخ صاحب آخر شیعہ ہو ہی گئے آتش ایسے جوش کے زمانہ میں ہرگز شیعہ نماز اور دونوں نمازوں کے فرق سے بیخبر نہیں رہ سکتے تھے؟

(۵) بقول آزاد "میر دوست علی خلیل شاگرد خاص تھے اور خلوت و جلوت کے حاضر باش۔ آتش کو جب اپنا مذہب شیعہ معلوم تھا تو کیوں نہ اپنے شیعہ شاگرد خاص اور خلوت و جلوت کے حاضر باش ہی سے نماز سیکھ لی۔

(۶) میر دوست علی خلیل شیعہ تھا۔ پھر اُن کے اُستاد آتش کی اتنی بیخبری کے کیا معنے؟

(۷) آتش جو بقول اثر صاحب ایسی غزل کہے اور خلیل ہر وقت اُسکی مصاحبت میں بھی رہیں۔ اُس کو اپنا شیعہ ہونا معلوم بھی ہو پھر بھی آتش نماز پڑھتا ہے تو سنیوں ہی کی؟ کسقدر حیرتناک امر ہے؟

(۸) آزاد نے کیا خوب فقرہ سوچکر لکھا ہے کہ:- "شاگرد نے کہہ دیا کہ استاد! عبادت الٰہی جتنی پوشیدہ ہو اتنی ہی اچھی"۔ شاید آزاد نے اس لئے لکھا کہ اہل سنت کے یہاں کھُلم کھُلا جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ انکے یہاں کوئی مخفی عبادت نہیں نہ وہ کسی کو کسی مخفی عبادت کی تعلیم و تلقین کرتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ فرضی نماز سکھانے میں اُس شاگرد کی کون سی مصلحت تھی؟

کہ اُس نے عبادت چھپانے کو کہا۔ غرض یہ ثابت ہے کہ بچپن میں نہیں عمر کی پختگی میں آتش نے سینوں کی نماز پڑھی۔ اس امر کو اس سے ملائیے کہ آتش سنی اور صوفی باپ کے یہاں پلے تھے۔ انھوں نے سینوں کی نمازیں دیکھی تھیں۔ تصوف کے اُن مدارج اور نکات سے آگاہ تھے۔ جنکی تفصیل اثر صاحب نے کی ہے۔ نیز آتش اس کے قائل تھے کہ در رند مشرب ہوں مجھکو کیا ہوئے + مذہب نہیں جو اختلاف ہو) نتیجہ صاف یہ نکلتا ہے کہ آزاد ہوں یا امیر سب نے اس معاملہ میں غلط بیانی سے کام لیا۔ اب اگر فی الحقیقت میر امیر نے یہ روایت بیان نہیں کی تھی بلکہ یہ بھی آزاد کی صنعت تھی تو اس کے ذمہ دار بھی آزاد اور اس کا وبال بھی آزاد ہی کے سر۔

۳۔ آتش کے بعض اشعار۔ مرزا صاحب کی پیش کردہ غزل اوپر لکھ آیا ہوں اور اگر مجھے بھی اُس کے ایسے ہی شعا کی جمع و تلاش مقصود ہو تو چند اور اشعار اُسکی شیعیت کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں:۔

قسم اول۔ (الف) لا تحف ایدل والی غزل۔

(ب) دیوان دوم کی پہلی غزل :۔ دل مرا بندہ نصیری کے خدا کا ہو گیا۔

(ج) دعائے آتش خستہ یہی ہے روز محشر کو ٭ یہ مشت خاک ہو کے کربلا کی خاک پیدا۔ (صفحہ ۹)

(ح) آتش کی التجا ہے یہی تم سے یا علی ٭ صدمہ نہو فشار لحد کے عذاب کا۔ (صفحہ ۲۴)

(د) آتش غم حسین میں رو ہنس رہا ہی کیا ٭ سطریں کی سطر نامہ عصیاں سے دور ہوں۔ (صفحہ ۱۰۹)

(ر) ہر جمعہ کو ظہور کا رہتا ہوں منتظر ٭ مشتاق ہوں امام کے پیچھے نماز کا (صفحہ ۲۱۲)

(ز) پیروی پیشوا کی لازم ہے ٭ روسیہ منکر امامت کا (صفحہ ۲۲۱)

---

(ک) دستِ علی کی ضرب کا جنبش میں ہے اثر ٭ ان ابروؤں میں معجزہ ہو ذوالفقار کا (صفحہ ۴۷)

قسم دوم:۔ (الف) سر سے حاضر منقبت میں کے لئے تامل ہو گیا ٭ مدح حیدر میں کمیت خامہ دلدل ہو گیا۔

(ب) خوں ریز جس قدر کہ ہو اس سے عجب نہیں ٭ آتش فراق یار بدتر ہے یزید کا (صفحہ ۲۱۴)

(ج) اک سال میں دس دن بھی جسے غم نہیں ہوتا ٭ وہ شہر ہے جس میں کہ محرم نہیں ہوتا (صفحہ ۲۲۱)

(ح) یا علی کہکر بت پندار توڑا چاہیئے ٭ نفس امارہ کی گردن کو مروڑا چاہیئے (صفحہ ۲۵۰)

---

ظاہر ہے کہ مجھے قسم دوم کے اشعار کا تو جواب دینا نہیں ہے۔ ان میں محض کوئی نام آگیا ہے اور اُن سے کوئی شیعی عقیدہ کھلا ہوا نہیں ظاہر ہوتا۔ الف اور ج کے اشعار اگر ایک سنی لکھنؤ میں بیٹھ کر کہے تو تعجب کا مقام نہیں (ب) میں غم فراق کو یزید سے بڑھ کر سمجھنا اور ابروؤں کو ذوالفقار کا اثر ماننا محض تشبیہی انداز بیان ہے اور نکتہ آفرینی۔ یا علیؑ کہکر بت توڑنا اس میں صریح اشارا ہے اس حدیث کی طرف جس میں ذکر ہے کہ رسول اکرم صلعم نے حضرت علیؑ کو بت اور اونچی قبر توڑنے پر مامور

کیا تھا۔ اس قسم کے بیانات تو سنیوں کے ہاں بھی ہیں۔ اور عام ہیں مثلاً

(الف) ذوق کی پہلی غزل کے یہ مصرعے ۱۔ محبت اہل بیتِ مصطفیٰ کی نورِ برحق ہے = ۲۔ کہیں شاہِ نجف کے عشق میں دل میرا اڑو با تھا = ۳۔ غمِ آلِ نبی سے دانۂ ہر اشکِ نم میرا = حالانکہ ذوق مسلّم طور پر سنی تھے۔

(ب) سید محمد مبین الدین صاحب مبین مچھلی شہری نے (جو سنی حنفی اور داغ مرحوم کے ارشدِ تلامذہ میں ہیں) ۱۲ رجب کو شیعوں کی ایک مجلس میں تعریفِ جناب امیرؑ میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جس کا ایک مصرعہ مجھے اس وقت یاد ہے۔ ع

وہی علیؑ کہ جو تھے خاتمِ خلافتِ خاص

(ج) اور کسی دوسرے کی مثال کیوں دوں، خود مجھ پر ایک زمانہ حبِ علیؑ کے جوش کا ایسا گزرا ہے کہ جب میں نے مقبول احمد دہلوی کی تفسیر کے رد میں اپنی تفسیر "فبہت الذی کفر" لکھی جو ملک میں شائع ہو چکی ہے۔ اُس کے دیباچہ میں میں نے لکھا تھا کہ محبت علی میں مجھکو وہ شغف اور غلو حاصل ہے کہ میں فضیلتِ شیخین کو بدعت اور ایک امرِ خارج از امورِ دین سمجھتا ہوں" لیکن ان سب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اور یہ سب لوگ بھی شیعہ ہو گئے۔ رہے دوسرے قسم کے اشعار تو

(۱) مجھے سرے سے اسی میں شک ہے کہ یہ اشعار آتش کے ہیں کیونکہ حسب تمہید نمبر ۲ سعدی و رومؔ پر تشیع کا اتہام حافظ کے نام سے الحاقی غزل اور قصائد۔ فردوسی کے نام سے ہجو محمود میں الحاقی اشعار۔ کتابوں اور تصنیفوں میں تحریف جب ہمارے سامنے ہے تو آتش کے کلام میں الحاقی اشعار کا ہونا کون سی بڑی بات تھی۔ آتش کا دوسرا دیوان تتمہ ہے جو انکی وفات کے بعد مرتب اور شائع ہوا ہے۔ اس لئے اس میں کافی موقع الحاق کا تھا۔ چنانچہ ہمکو پہلی ہی غزل بلا مقطع کے پانچ شعر کی ملتی ہے غالباً پنجتن کی رعایت سے اور اس میں شروع سے آخر تک ہر شعر میں شیعیت بھری ہے۔ پہلا دیوان اگرچہ اُن کی زندگی ہی میں طبع اور شائع ہو چکا تھا لیکن اُس میں بھی الحاقی اشعار بیچ بیچ میں داخل کئے جا سکتے تھے۔ کیونکہ شاگرد خاص اور خلوت و جلوت کے حاضر باش جو صاحب تھے وہ شیعہ ہی تھے اور آتش جیسے بھنگ نوش رند اور لااُبالی شاعر سے غالباً اس بیدار مغزی اور باخبری کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ اُس نے اپنے نام سے شائع شدہ دیوان کی ہر جگہ سے تنقیح اور جانچ کر لی ہو۔

(۲) آتش کے حالات وصفات، اطوار و اشعار آپ کے سامنے ہیں۔ ان سے ایک حد تک آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان اوصاف کے آدمی سے ہم کو کس کس قسم کی باتوں کی توقع ہو سکتی ہے۔ وہ زیادہ تر تو وراثت کے تصوف کیطرف زیادہ مائل نظر آتا ہے یا لکھنؤ کی فضا سے متاثر ہوتا ہے تو اس حد تک کہ کنگھی چوٹی۔ محرم کرتی کے اشعار بھی کہہ جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ غزل کے مطالبات اور خصوصیات سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ غزل، غزل ہے نہ کہ مرثیہ وسلام۔ تغزل میں فرقہ وارانہ عقائد اور سخت لہجہ اور تبرے کی گنجائش کہاں؟ چونکہ اس سے سخت تنگ نظری ٹپکتی ہے۔ اس لئے عموماً اساتذہ اور ثقہ لوگ اس سے اجتناب کرتے ہیں، آتش جس کے بارہ میں اہلِ نظر کا خیال ہے کہ غالب سے کسی طرح تغزل کی بلند پروازیوں میں کم نہ تھا، ہرگز اس کلیہ سے بیخبر اور اس اُصولِ اخلاق سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ تنگ نظر اور فرومایہ شعرا ایسا کر سکتے ہیں۔

(۳) مسلمان صاحب دیوان شعرا کا طریقہ یہ رہا ہے کہ برکت کے خیال سے شروع میں حمد و نعت (اور اگر شیعہ ہو تو) منقبت ضرور کہتے ہیں۔ آتش کے پہلے دیوان میں سوائے حمد معرفت کے شروع کے سات آٹھ صفحات تک کچھ ہے ہی نہیں۔ یہ آتش کیسا شیعہ تھا اپنی زندگی میں شائع ہونیوالے دیوان میں نہ نعت کہی نہ منقبت۔ اور منقبت کہی تو وہ ردیف "لام" میں جا چھپی۔

(۴) کسی شیعی شاعر کا بھی یہ رویہ دیکھا نہیں گیا کہ شروع کی منقبت کے علاوہ غزل کے ہر شعر میں ایک ہی عقیدے کا اظہار ہو۔ ایک مذہب کی تبلیغ ہو۔ آتش ہی نے اپنے دیوان صفحہ ۲۴۴ پر ایک مطلع لکھا ہے۔ (ور د زباں جناب محمدؐ کا نام ہی قابل درود پڑھنے کے اپنا کلام ہے) بہ ظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ غزل نعتیہ ہے۔ مگر سوا اس شعر کے اور ایک شعر بھی نعت میں نہیں۔ اور یہ بات اُسی مذکورہ اصول کے ماتحت ہے کہ ہر شعر میں کسی عقیدے کا اظہار معیوب ہے۔

(۵) اسی نعتیہ مطلع کے بعد ایک موقع منقبت کے ذکر کا تھا مگر آتش کی توجہ اسطرف نہیں ہوتی۔

(۶) پھر کیا ایک واقعی شیعہ شاعر کے ہاں شیعیت کا اظہار اسی طرح ہوتا ہے کہ پوری پوری غزلوں میں اور ہر شعر میں (جو منقبت کی جگہ شروع میں نہ لکھی گئی ہوں) اپنے عقیدے کا اظہار کرے اور "شیطان کے نطفہ الخ" جیسے سخت اور گندہ لہجہ میں اپنا مذہب دکھائے؟ اور خاصکر آتش جیسے بھولے بھالے۔ صوفی کے یہاں؟

کیا اب بھی ان اشعار کے الحاقی ہونے میں کسی کو کچھ شبہ ہو سکتا ہے؟ کیا یہ صاف نہیں معلوم ہوتا کہ کسی اور نے اُس کی غزل کو ردیف "لام" میں اس لئے لکھا کہ اس پر آتش کی یا دوسروں کی نظر جلد نہ پڑے؟ پھر اگر یہ اشعار آتش کے ہوتے تو محمد حسین آزاد (جو مذہب کو مشتبہ کرنے کی فکر میں ہمیشہ رہتے ہیں اور نازوالی پوچ روایات تک اسی مقصد سے گڑھتے ہیں) کیوں نہ تذکرہ آتش میں کوئی غزل یا کوئی شعر ایسا نقل کر دیتے؟ حالانکہ اُس نے آبحیات میں تصریح کر دی ہے کہ آتش کے دواوین اُس کی نظر سے گذرے ہیں۔ اگر اُس کو یہ اشعار مل جاتے تو کیوں نہ وہ آتش کا مذہب صاف صاف شیعہ لکھ جاتا۔ حالانکہ آزاد وہی ہیں جنھوں نے غالب کو "منصور فرقہ اسد اللّٰہیان منم" سے فائدہ اُٹھا کر اُن کو نصیری کہا ہے اور خوب خوب مزے لئے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آتش جیسے اُستاد کے ہاں زبان کی یہ غلطیاں بھی مل سکیں گی؟

(الف) پیروی پیشوا کی لازم ہے۔ روسیہ منکر امامت کا۔ دوسرے مصرعہ میں اُس نے کہا ہے "منکر امامت کا روسیہ (ہو)" لیکن اس میں یا تو "کا" زائد ہے اسکی جگہ "ہے یا ہو" ہونا چاہیئے۔ اور با محاورہ میں ناجائز تصرف کیا ہے اس لئے کہ محاورہ یوں ہے۔ "اس کا منھ کالا" یا "اُس کا رو سیاہ" لیکن "اُس کا روسیہ" درست نہیں۔

(ب) دعائے آتش خستہ یہی ہے روز محشر کو۔ اس میں "کو" حشو محض ہے۔

(ج) دل مرا بندہ نصیری کے خدا کا ہو گیا۔ اس میں تعقید لفظی ہے اور مکروہ۔

بہر حال روز روشن کی طرح یہ بات نظر آرہی ہے کہ یہ سب "آزاد کے کسی اہل راز" کی ایک ایجاد ہے۔ لیکن وہ اسکو بھول گیا کہ اس شدت و غلو، اس جوش و کثرت، اس لہجہ و طریقہ سے اور شبہ پیدا ہو جائے گا اور جب آتش جیسے بھولے بھالے

اور تصوف گو سادہ مزاج شخص کے منھ پر یہ اشعار نہ کھلیں گے تو پڑھنے والے صاف معلوم کرلیں گے کہ یہ جعلی لحاق ہے۔

یہاں تک تو جوابات تھے اُن شکوک کے جو پیدا کئے گئے یا پیدا کئے جاسکتے تھے۔ آتش کے تسنن کے بارہ میں اب مختصراً اسکے وجوہ تسنن بیان کرتا ہوں:۔

(۱) آتش صوفی اور سنی باپ کا بیٹا تھا۔ خود تصوف گو تھا۔ سیدھا اور بھولا تھا اور مذہبوں کے جھگڑوں سے دور رہتا تھا۔ یہ اوصاف بجائے خود اُس کے شیعہ ہونے سے ابا کرتے ہیں۔

(۲) اُس زمانہ میں بادشاہ کے تشیع کا اثر رعایا پر بہت تھا۔ اور اکثر لوگ تبدیل مذہب کرکے شیعہ ہو جاتے تھے مگر صرف وہی جن کو دربار میں رسائی کا شوق اور مال وجاہ کا لالچ تھا۔

چنانچہ شیخ امام بخش ناسخ کو یہ شرف نصیب ہوا کہ بقول آزاد پہلے مذہب سنت و جماعت رکھتے تھے پھر شیعہ ہو گئے ان کی زندگی تمام تر سیاسی چالوں میں گذری اور دنیا طلبی کے ذرائع ان کو اچھے حاصل تھے۔ لیکن آتش کو دربار سے تعلق اور امرا بادشاہ کے ہاں رسائی کا شوق نہ تھا۔ اس نے بادشاہ کا خلعت واپس کردیا۔ اور ایک رئیس شاگرد سے ملتے ہوئے روپلے لوٹا دیئے۔ وہ متوکل قانع وعزلت گزیں تھا۔ ایسے شخص پر اس وقت کی آب وہوا کا اثر نہ پڑ سکتا تھا نہ پڑا۔

(۳) کسی تذکرہ نویس نے آتش کو شیعہ نہیں لکھا یہاں تک کہ آزاد نے بھی نہ آتش کے تبدیل مذہب کا ذکر کیا نہ صاف طور سے اُس کو شیعہ لکھا۔ رہا اثر صاحب کا لکھنا تو اُنھوں نے یہ روش اختیار کی ہے کہ دوسرے لوگ جعلی روایات اور الحاق سے جو بنیادی اینٹ رکھ گئے تھے۔ اس پر پوری عمارت کھڑی کردی ہے۔ لیکن یہ نہ دیکھا کہ بنیاد ہی پانی پر تھی۔

(۴) آتش نے ایک دفعہ مرزا دبیر کے مرثیہ پر صاف کہدیا کہ "یہ مرثیہ تھا یا لندھور بن سعدان کی داستان"۔ اور ایک شیعہ مرثیہ جیسی مذہبی چیز پر ایسی سخت طنز نہیں کرسکتا۔

ہر چند کہ اس مضمون میں اب تک مرزا اثر صاحب کے مضمون پر استطراداً کچھ نقد وبحث آچکی ہے لیکن بعض اور باتیں بھی اُنکے مضمون میں ایسی ہیں جو کسی طرح نظر انداز نہیں کیجا سکتیں۔

۱۔ مرزا صاحب غالباً بے خیالی میں ایک ایسی بات لکھ گئے ہیں۔ جس پر اطلاع ہونے کے بعد یقیناً اُن کو اس سے اختلاف ہوگا۔ اور وہ یہ کہ عام شعرائے لکھنؤ کا کلام تصوف سے خالی ہے۔ لیکن کیا اثر صاحب براہ کرم بتائیں گے کہ تصوف (جو جان تغزل۔ خمیر تغزل۔ بلکہ تمام تغزل ہوتا ہے اُس) کے لکھنؤ میں نہ ہونے کی کیا وجہ تھی یا ہوسکتی ہے؟ کیا اس کا جواب سوائے اس کے اور بھی کچھ ہوسکتا ہے کہ وہاں شیعیت کا زور تھا اس لئے تصوف کا چرچا نہ تھا یعنی سرزمین لکھنؤ، مفتی محمد عباس جیسی ہستیاں تو پیدا کرسکتی تھی جو یہ کہہ سکے کہ (این کلام صوفیانِ شوم ہنیت الخ) لیکن خواجہ میر درد، میر سوز، مرزا مظہر، شاہ ولی شاہ حاتم، میر اور غالب اور آخر آخر میں آتش جیسے مقدس وجود نہ پیدا کرسکی۔

۲۔ مرزا صاحب نے آتش کے مضمون میں آبِ بقا سے بھی استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ ابتدا مضمون ہی میں حوالہ موجود ہے۔

لیکن خاص موقعوں پر وہ آزاد کی تقلید کر گئے ہیں۔ "فسانہ کیا" "بہانہ کیا" والے مشاعرے کے ذکر میں آب حیات نے لکھا تھا کہ نواب نے دوسرا خلعت آتش کو دے کر رخصت کیا۔ یہی مرزا صاحب بھی نقل کر گئے۔ حالانکہ آب بقا میں ہے کہ آتش نے خلعت لینے سے انکار کیا بلکہ اُسے بھی ناسخ ہی کو دلوا دیا اور خود شاہی گڑگڑی پر قناعت کی۔ آتش جیسا توکل شخص اور وہ معرکۂ خاص کہ ناسخ نے "دشمنی ہم پیشگی" برتی اور طرح کی اطلاع صرف ایک روز قبل آتش کو دی۔ اس صورت میں آتش کا خلعت قبول کر لینا۔ آتش کو کچھ اعلےٰ ثابت نہیں کرتا۔ بلکہ آب بقا کی روایت سے اس کی عالی ہمتی۔ سیر چشمی۔ اور صبر و توکل کا نہایت اعلےٰ نمونہ نظر آتا ہے۔
اگر اثر صاحب کوئی جامع اور مختتم مضمون لکھ رہے تھے تو یا تو اپنے ممدوح کی بابت عالی ہمتی کی روایت لکھتے۔ جس سے اس کی شخصیت بلند معلوم ہو۔ یا پھر اُصولاً دونوں روایتیں جمع کر دیتے۔ لیکن آخر یہ راز کیا ہے کہ کوئی مضمون تلاش و جستجو سے بھی لکھا جائے تو ایک مشہور و مسلم کذاب و افسانہ گو مورخ کی تقلید تو کیجائے اور دوسرے مورخ کو یوں نذر تغافل کیا جائے گویا اس کا وجود ہی نہ تھا۔ اگر آب بقا بروئے کار نہ آیا ہوتا یا اثر صاحب نے اس سے استفادہ نہ کیا ہوتا تو کچھ حرج نہ تھا۔ لیکن وضعداری اور آزاد پرستی کم سے کم اتنی تو ہو کہ آنکھ بند کر کے اس کو امام بنایا جاتا ہے۔

سلسلۂ سخن میں لکھنا پڑتا ہے کہ آب حیات ہرگز اس قابل نہیں کہ اس پر اعتبار کیا جا سکے۔ اس کی دروغ نویسی اس حد تک پہونچی ہوئی ہے کہ مرزا عسکری صاحب (مترجم تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ) کو دیباچہ ترجمہ تاریخ ادب اردو میں لکھنا پڑا کہ اُس نے افسانہ نویسی کی ہے۔ تاریخ نہیں لکھی۔ اس نے کہیں کہیں ایسی باتیں لکھی ہیں جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ اور یہ تنقیدیں جو برابر نکلتی آ رہی ہیں لازمہ اور خمیازہ ہیں۔ ان غلطیوں کا جو آزاد نے آبحیات میں کی ہیں۔

۳- مرزا صاحب نے اُستاد سے نزاع والی روایت بھی جس کی حقیقت آپ اوپر پڑھ آئے ہیں۔ آبحیات سے نقل کر دی۔ تنقیدی نظر نہ ہونے کے علاوہ مرزا صاحب یہ بھی تو نہیں درج کرتے کہ اور تذکرہ نویسوں کے ہاں اس کا ذکر تک نہیں تاکہ پڑھنے والوں کو یہ تو معلوم ہو جائے کہ آزاد اس روایت میں منفرد ہیں۔ پھر جو درجہ اُس کا قائم ہو سکتا وہ اپنے دل میں اس روایت کا قائم کرتے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مرزا صاحب کو آتش کے حالات میں تلاش و تحقیق یعنی ریسرچ کرنا نہیں تھا اور درایت و تنقید کی بجائے تقلید منظور تھی تو پھر مضمون کی ضرورت ہی کیا تھی؟

۴- مرزا صاحب نے بھی وہی آزاد کا سا یقین و اطمینان پیدا کر کے مذہب کی بابت لکھدیا کہ "شیعہ تھا" گویا یہ مسلم ہے اور اگر پوچھا جائے کہ حضور یہ دو ٹوک فیصلہ کسی اور نے بھی کیا ہے جو آپ نے جلدی سے لکھ دیا؟ تو شاید جواب آسان نہ ہو۔ آزاد ہی کو دیکھئے، دیوان دیکھ چکا ہے مگر تشیع ریز اشعار نہیں لکھتا۔ اس کا دل خود چاہتا ہے کہ لکھنؤ کے دور تشیع کے ایک نامی شاعر کو شیعہ کر دکھائے مگر کوئی بات نہیں ملتی ناچار ایک پوچ روایت گڑھتا ہے اور زور پیدا کرنے کے لئے ایک دوسرے شخص کو اپنی مدد کے لئے بلاتا ہے کہ جو کچھ راست و دروغ ہو بہ گردن راوی" مگر وہ بھی کم درشابت ہو۔ پھر کوئی تذکرہ نویس اسکو شیعہ نہیں لکھتا یہ جناب

نے کیسے فیصلہ صادر کر دیا۔ کسی عدالت پر بھی تو اتنی جلد حکم نہیں لگایا جاتا۔ اس سے بھی بڑھ کر بوالعجبی اور مرزا صاحب کی دلی پریشانی وہاں ظاہر ہوتی ہے۔ جہاں یہ پُر لطف جملہ لکھا ہے" وہ ایک آزاد شاعر تھا اور باستثناء اُن حالتوں کے جب وہ کسی مذہبی عقیدے کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھول جاتا تھا کہ اُس کا مذہب کیا ہے" واہ کیا خوب استثناء کیا ہے۔ آٹے سے بال نکالنا اسے کہتے ہیں لیکن اب بھی نتیجہ صاف یہی نظر آرہا ہے کہ مرزا صاحب پیش بندی کرنا اور ایک گنجائش نکالنا چاہتے ہیں اور جس طرح "آزاد" اور "اہلِ راز" کے پیدا کردہ شبہوں اور موقعوں سے مرزا صاحب نے فائدہ اُٹھایا ویسے ہی مرزا صاحب کی تحریر سے کسی دوسرے کو فائدہ اُٹھانے کا موقعہ ملے۔

۵۔ مرزا صاحب نے اپنے مضمون میں جہاں آتش کے اشعار کی تقسیم کی ہے۔ وہاں "مسئلہ رویت" کا عنوان قائم کر کے یہ تین شعر لکھے ہیں۔

(الف) بوئے گُل آتش کہیں ہوتی ہے محبوسِ نظر ٭ افترا ہے روزِ روشن یار کے دیدار کا۔

مرزا صاحب نے اس پر نوٹ لکھا ہے" دیدار اسکی معرفت دل سے ہے۔ آنکھیں نہیں دیکھ سکتی ہیں"۔ لیکن سخت تعجب ہے کہ مرزا صاحب نے اس کو مسئلہ رویت کے عقیدے پر شاعر کی رائے سمجھا۔ حالانکہ صاف نظر آرہا ہے وہ مضمون آفرینی کے طور پر یہ کہہ رہا ہے" ہمیں تو اس کی معرفت دل سے یہیں حاصل ہے۔ پھر دیدار کا انحصار صرف روزِ محشر پر ہم کیوں مانیں۔ روزِ محشر پر دیدار کا انحصار ہمیں تو افترا معلوم ہوتا ہے۔

(ب) گرے گی برقِ جمال اس کی بند آنکھوں کو ٭ وہ خلوتی اگر اے انجمن نظر آیا۔

مرزا صاحب کا نوٹ اس پر یہ ہے کہ دیدار اس لئے بھی محال ہے کہ اُس نے یہ شعر کہا۔ افسوس ہے کہ مرزا صاحب نے اس کو تو عقیدہ رویت پر اظہار خیال سمجھا (حالانکہ اس میں محشر کا ذکر ہے نہ اس کا اشارہ حتیٰ کہ انجمن سے بھی محشر مراد نہیں) لیکن آگے خود ہی (مقام حیرت) کے عنوان سے ایک شعر لکھا ہے۔ جو ٹھیک اسی مضمون و مفہوم کا ہے۔ اس سے عقیدہ رویت پر اظہار خیال نہیں سمجھتے۔ وہ شعر یہ ہے:" اُلٹا ادھر نقاب تو پردے پڑے اُدھر ٭ آنکھوں کو بند جلوۂ دیدار نے کیا"

یہاں یہ بات بھی نظر انداز نہ کرنی چاہئے کہ آنکھیں جلوہ دیکھنے کے بعد بند ہوں گی نہ کہ دیکھنے سے قبل۔ پس دیدار اور ایفائے وعدہ دیدار تو ہو گیا۔ رہا آنکھوں کا بند ہو جانا تو یہ اُس کے حسن کا کمال ہے اور اپنے ظرف کی کمی۔

(ج) اُٹھ چکا روزِ قیامت روئے قاتل سے نقاب ٭ روزِ محشر نگہ کے تیر کی منزل نہ ہو۔

مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ رویت کا محال ہونا اس میں بھی دکھایا ہے۔ افسوس کہ اس شعر کے بارے میں ہمکو مرزا صاحب کے خیالات نہ معلوم ہو سکے کہ دوسرے مصرعہ کا مطلب اُنھوں نے کیا سمجھا ہے۔ اس لئے کچھ لکھنا ذرا بے موقعہ ہے۔

ان اشعار کے مطلب و معنی کی طرح مختصراً اشارہ کیا جا چکا۔ لیکن مرزا صاحب کے اس جملہ نے" تصوف میں مسئلہ رویت مختلف فیہ ہے"۔ ہمکو بہت دیر تک غرقِ حیرت رکھا۔

مرزا صاحب نے "تصوف میں رویت کا انکار" کہیں سے سُن لیا ہوگا۔ اس لئے اس استدلال سے کام لیا بندہ نواز، صوفیوں کے ہاں نفس رویت خداوندی سے انکار نہیں اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ صوفی جو خدا کا طالب ہوتا ہے۔ کس منھ سے دیدار محبوب کا انکار کرے گا؟ بلکہ اختلاف اس امر میں ہے کہ یہاں اس دنیا میں اس جسم خاکی کے ساتھ اُن آنکھوں سے بھی دیدار ہو سکے گا یا نہیں؟ اس میں بعض قائل ہیں۔ ہو سکتا ہے اور بعض منکر۔ یہی اختلاف اسلام کے بعض فرق ظاہرہ میں بھی ہے اور معتزلہ نے اس سے صاف انکار کیا ہے (عقائد نسفی میں اسکی پوری بحث موجود ہے)

ایک صوفی کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔ "ع بقرآں ہم بنا در دہ است ایماں زاہد اعمیٰ اگر دیدار اینجا نیست آخر جلوہ گاہ ہے کو؟" لیکن اس میں رویت کا جو پہلو بیان ہوا ہے۔ ظاہر ہے۔ لیجئے یہ تھا مطلب رویت سے اختلاف کا جسے جناب اثر صاحب جیسے اہل قلم نے واقف کارانہ انداز میں اس شد و مد سے لکھا ہے۔

سراج الحق مچھلی شہری

---


# مثنوی نہر عشق

## مرتبہ مجنوں گورکھپوری

جس میں مجنوں گورکھپوری، عبد الماجد دریابادی احسن لکھنوی، نیاز فتحپوری کے مقدمات شامل ہیں۔ ایک تصویر سہ رنگی، دو تصاویر یک رنگی زریں جلد۔ کتابت طباعت نہایت اعلےٰ۔ قیمت علاوہ محصول (عہ)

مینجر "نگار"

# گہوارۂ تمدن

## جدید ایڈیشن

مولانا نیاز فتحپوری کی وہ معرکۃ الآرا تصنیف جو اپنے موضوع کے لحاظ سے اُردو میں پہلی کتاب ہے جس میں تاریخ، آثار قدیمہ اور اساطیر کی رو سے بتایا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی عورت کی کس درجہ ممنون ہے۔

قیمت علاوہ محصول (عہ)

مینجر "نگار"

# جبریہ شادی

## (ڈرامہ)

فرانسیسی ڈرامہ نگار مولیئر کا ایک شاہکار

## افراد ڈرامہ

(۱) سنارل :- ڈورمین کا ہونیوالا خاوند
(۲) ڈورمین :- ایلکانسٹر کی بیٹی
(۳) ایلکانسٹر :- ڈورمین کا باپ
(۴) ایلیڈاس :- ڈورمین کا مشہور شمشیر زن بھائی
(۵) جیرونیمو :- سنارل کا دوست
(۶) پنکریس :- ایک فلسفی
(۷) مارفوریس :- ایک اور فلسفی
(۸) لائیکاٹ :- ڈورمین کا عاشق
(۹) ملازم وغیرہ جپسی عورتیں

---

سنارل (پس پردہ ملازم سے)

س - میں ابھی واپس آتا ہوں - گھر کا خیال رکھنا - اور اگر کوئی روپے دینے آئے تو مجھے فوراً مسٹر جیرونیمو کے مکان پر اطلاع دینا - اور اگر کوئی روپیہ لینے آئے تو اس سے کہدینا کہ میں یہاں نہیں ہوں - اور نہ آج واپس آؤں گا -

جیرونیمو - (سنارل کے آخری الفاظ سنکر) اچھی پیش بینی ہے

س - آہ جیرونیمو خوب پہونچے - میں تو تمہارے ہی گھر جارہا تھا -

ج - کیوں خیر تو ہے ؟

س - تم سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا تھا -

ج - بڑی خوشی سے - میرا خیال ہے :- ہم یہاں اچھی طرح سے گفتگو کر سکتے ہیں -

س - تو پھر بیٹھ جاؤ - معاملہ بہت اہم ہے - اور میں کوئی کام دوستوں کے مشورہ لبغیر نہیں کرنا چاہتا -

ج - میں ممنون ہوں کہ تم نے مجھے اس کام کے لئے منتخب کیا - اچھا بتاؤ کیا بات ہے ؟

س - مگر سب سے پہلے میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خوشامد درامد کی ضرورت نہیں تم مجھے صحیح صحیح رائے دینا -

ج - ایسا ہی ہوگا -

س - قسم کھاؤ -

ج - تمہاری قسم۔ اچھا تو اب معاملہ بتاؤ۔

س - میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا تھا۔ کہ میں شادی کروں یا نہ کروں؟

ج - کون؟ تم

س - ہاں میں۔ تمہارا اس کی نسبت کیا خیال ہے؟

ج - مگر پہلے مجھے ایک بات بتاؤ۔

س - کیا؟

ج - تمہارے خیال میں تمہاری عمر کتنی ہے؟

س - میری۔

ج - ہاں۔

س - مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں۔

ج - سنا ہے تم باون یا ترپن سال کے ہوگے۔

س - کون؟ میں! یہ نہیں ہو سکتا۔

ج - بہر حال میں تمہیں حسب وعدہ یہ رائے دیتا ہوں کہ تم شادی کرنے کے ناقابل ہو۔ میں تمہیں یہ مشورہ دونگا۔ کہ اس جنون کو سر سے نکال دو۔ اگر تم اتنے عرصہ تک آزاد رہنے کے بعد اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ لوگے تم جیسا بدقسمت انسان دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔

س - اور میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں شادی کرنیکا مصمم ارادہ کر چکا ہوں۔ اور میں اپنی محبوبہ سے شادی کرنے میں کسی لیت و لعل و تاخیر سے کام نہیں لوں گا۔

ج - خیر یہ معاملہ اور ہے۔ مجھے تو تم نے یہ نہیں بتایا تھا۔

س - میں اُس لڑکی کو بہت پسند کرتا ہوں۔ اور دل سے چاہتا ہوں۔

ج - تم اُسے دل سے چاہتے ہو؟

س - بے شک اور میں نے اُس کے باپ سے بھی پوچھ لیا ہے۔

ج - باپ سے بھی؟

س - ہاں۔ آج شام کو شادی ہونیوالی ہے۔ اس کا تصفیہ ہو چکا ہے۔

ج - تو پھر شادی کرو۔ میں اس میں دخل دینا نہیں چاہتا۔

س - مگر جیرونیمو تمہارا خیال ہے کہ میں ارادہ فسخ کر دوں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں شادی کرنیکے ناقابل ہوں؟ میری عمر کو چھوڑو۔ واقعات کو صحیح روشنی میں دیکھو کہ وہ کیا ہیں؟ کیا کوئی سی سالہ آدمی مجھ سے زیادہ توانا و تندرست ہے؟ کیا میرے اعضا و حواس باقاعدہ کام نہیں کرتے؟

ج - تمہارا خیال صحیح ہے۔ میں غلطی پر تھا۔ ضرور شادی کرو اس سے بہتر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

س - پہلے میں شادی کرنے کے خلاف تھا۔ مگر اب میری رائے بدل چکی ہے۔ اور میرے پاس اس کے لئے متعدد دلائل ہیں۔ بیوی کی معیت سے حصول مسرت کے علاوہ جو بڑا فائدہ پہونچنے کی توقع ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہماری نسل باقی رہیگی۔ جو بصورت دیگر معدوم ہو جائے گی۔

ج - بے شک یہ خیال بہت اچھا ہے۔ اور میں تمہیں مشورہ دونگا کہ جلد از جلد شادی کر لو۔

س - سچ مچ؟ کیا تم یہ مشورہ دیتے ہو؟

ج - یقیناً اس سے بہتر اور کیا کام ہو سکتا ہے؟

س - میں بہت خوش ہوں کہ تم ایک مخلص دوست کی طرح مجھے مشورہ دے رہے ہو۔

ج - مگر تم شادی کس عورت سے کرنا چاہتے ہو؟

س - ڈورین سے۔

ج۔ وہ خوش پوش اور خوش باش نوجوان سی لڑکی۔

س۔ ہاں وہی۔

ج۔ ایلکانسٹر کی بیٹی؟

س۔ ہاں، وہی۔

ج۔ مشہور شمشیر زن ایلیسیڈاس کی بہن؟

س۔ ہاں، وہی۔

ج۔ خوب!

س۔ کیوں تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟

ج۔ اچھا رشتہ ہے۔ ضرور شادی کر لو۔

س۔ کیا میں نے اچھا انتخاب نہیں کیا؟

ج۔ بے شک۔ مگر جلدی کرو۔

س۔ میں تم سے یہ سن کر بہت خوش ہوا ہوں۔ اور تمہیں آج شام کو برات میں شامل ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔

ج۔ شکریہ میں ضرور آؤں گا۔

س۔ روز بخیر۔

ج۔ (ایک طرف) نوجوان ڈورین! ایلکانسٹر کی بیٹی۔ اور سنارل سے شادی۔ جو ابھی صرف اکاون سال کا ہے۔ اچھا رشتہ ہے! کیا ہی اچھا رشتہ ہے! (دہراتے ہوئے چلا جاتا ہے)

## سنارل (تنہا)

یہ شادی یقیناً سعید ثابت ہوگی۔ کیونکہ جو بھی مجھ سے اس کے متعلق سنتا ہے۔ ہنستا ہے۔ اخاہ! میں کتنا خوش نصیب انسان ہوں۔

## ڈورمین

ڈورمین (ملازم سے) دیکھو گاڑی کا خیال رکھنا۔

سنارل (ایک طرف ڈورمین کو دیکھ کر) وہ میری مالکہ آپہونچی۔ کتنی دلربا ہے؟ کیا شان ہے؟ کس رعنائی سے چل رہی ہے اسے دیکھ کر کس کا جی شادی کرنے کو نہ چاہے گا۔ (استقبال کرتے ہوئے) تم کہاں جا رہی ہو؟

ڈ۔ میں کچھ خریدنے جا رہی ہوں۔

س۔ کیا تم اس شادی پر خوش ہو؟ ........۔ میرا تو خیال ہے ہم بہت لطف سے زندگی بسر کرینگے۔ مجھے تم پر ہر ایک طرح کا حق حاصل ہوگا۔ اور تم میری ہر ایک خواہش کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھو گی۔

ڈ۔ میں بہت خوش ہوں، کیونکہ میرا باپ مجھے بہت بری حالت میں رکھتا ہے۔ میں اپنی آزادی کے لئے آج تک اپنے باپ سے لڑتی رہی ہوں۔ میری بہت خواہش تھی کہ مجھے جلد از جلد کوئی خاوند ملجائے۔ تاکہ آزاد ہو کر اس کے پاس جو چاہوں کروں سو خدا کا شکر ہے کہ یہ آرزو پوری ہو رہی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں آج سے ہمہ تن مسرت و انبساط ہوں۔ اور وقت کا بہترین مصرف دنیاوی آسائشوں کا حصول سمجھوں گی۔ چونکہ تم عالی نسب اور نئی روشنی کے آدمی ہو۔ اس لئے تم یہ کبھی نہیں چاہو گے کہ میں چمگادڑوں، اور الوؤں کی طرح مکان کی چار دیواری میں محصور رہوں۔ تنہائی مجھے کاٹنے دوڑتی ہے۔ میرا دل۔ کلب تھیٹر اور رقص گاہوں میں خوب لگتا ہے، تم میری جیسی بیوی پا کر بہت خوش ہوگے۔ ہم میں کسی طرح کے جھگڑے نہیں ہونگے نہ تم میری نقل و حرکت پر معترض ہوگے۔ نہ مجھے تم سے کسی طرح کا تعرض ہوگا۔ الغرض ہم اس طرح رہیں گے گویا موجودہ زمانہ کی روش سے پوری طرح واقف ہیں۔ مگر کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان سے نظر آتے ہو۔

س۔ میرے سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔

ڈ۔ آج کل یہ مرض عام ہے۔ مگر ہماری شادی یہ درد سر رفع کر دیگی۔ اچھا روز بخیر۔ میں ایک اچھا سا سایہ خریدنا چاہتی ہوں۔ اور ان چیتھڑوں کو پھینک دوں گی۔ میں آج تمام ضروری چیزیں خرید لوں گی۔ اور بل تمہیں بھجوا دوں گی۔

### جیرونیمو اور سنارل

جیرونیمو۔ آہ سنارل۔ میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں آج ایک جوہری سے ملا تھا۔ اور اُس کے پاس ایک نہایت قیمتی ہیرا ہے جو تم اپنی ہونیوالی بیوی کو شادی کے موقعہ پر تحفہ کے طور پر دے سکتے ہو۔

س۔ ابھی رہنے دو کوئی جلدی نہیں۔

ج۔ کیوں؟ اس کا کیا مطلب ہے؟ وہ کل والا شوق کہاں گیا؟

س۔ اصل بات یہ ہے کہ میں چند گذشتہ لمحوں سے بہت پریشان ہوں۔ آگے بڑھنے سے پیشتر میں اس معاملہ کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ میں نے ایک خواب دیکھا ہے اور تمہیں معلوم ہے۔ کہ بعض دفعہ خواب ہمارے مستقبل پر روشنی ڈالتے ہیں میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں ایک جہاز میں ہوں۔ اور جہاز بھنور میں ..........

ج۔ سنارل مجھے ایک کام ہے۔ اس لئے میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔ میں خواب کی تعبیر نہیں بتا سکتا۔ تمہارے پڑوسی حکیم اور فلسفی ہیں۔ اُن سے اس کی تعبیر دریافت کر لو۔

س (تنہا) یہ درست ہے۔ مجھے ان لوگوں سے مشورہ لینا چاہئے۔

پینکریس (ایک فلسفی) کسی سے پس پردہ بول رہا ہے اور سنارل کو نہیں دیکھتا۔

پ۔ جاؤ تم بہت گستاخ ہو اور علوم و فنون سے قطعاً بے بہرہ ہو۔

س۔ خوب! میں بر وقت پہونچا۔

پ۔ (سنارل کو نہ دیکھتے ہوئے) میرے پاس اس دعوے کی تائید میں زبردست شواہد ہیں۔ میں ارسطو کی کتابوں سے ثابت کروں گا کہ تم جاہلِ مطلق ہو۔

س۔ کسی سے لڑ رہا ہے (پینکریس سے) جناب!

پ۔ (مثل سابق) تم بحث کرنا چاہتے ہو۔ اور منطق کے ابجد سے بھی واقف نہیں۔

س۔ اُسے غصے میں دکھائی بھی نہیں دیتا (پینکریس سے) جناب!

پ۔ (مثل سابق) یہ مسئلہ تمام فلسفہ میں ناقص تسلیم کیا گیا ہے۔

س۔ کسی نے بہت برافروختہ کر دیا ہے (پینکریس سے) میں کہتا ہوں۔

پ۔ (مثل سابق) غلط ہے اور بالکل غلط ہے۔

س۔ قبلہ ذرا ادھر تو آئیے۔

پ۔ فرمائیے۔

س۔ کیا میں ..........؟

پ۔ (دوبارہ لڑتے ہوئے) تم جانتے ہو یہ کونسا مسئلہ ہے یہ مسئلہ قیاس ہے۔

س۔ میں ..........؟

پ۔ (مثل سابق) کبریٰ غلط ہے۔ اور صغرا معمولی۔ اور نتیجہ مضحکہ خیز۔

س۔ میں ..........

پ ۔ (مثل سابق) میں موت کو تمہاری بات کے قبول کرنے پر ترجیح دیتا ہوں ۔ اور میں اپنی رائے پر آخری دم تک قائم رہوں گا ۔

س ۔ کیا میں .........

پ ۔ ہاں ۔ میں اس مسئلہ کی تادمِ آخر تردید کروں گا ۔

س ۔ ارسطو صاحب کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس قدر آتش زیر پا کیوں ہیں ؟

پ ۔ نہایت معقول وجہ ہے ۔

س ۔ مگر کیا ہے ؟

پ ۔ ایک جاہل ایک غلط مسئلہ پر مصر ہے ۔

س ۔ مگر وہ ہے کیا ؟

پ ۔ آہ مسٹر سنارل ۔ آج کل ہر ایک چیز کی قلب ماہیت ہو چکی ہے ۔ دنیا نقائص سے مملو ہو رہی ہے ۔ حکومت کے منصفوں کو چاہیئے کہ وہ ایسے غلط مسئلہ کو سن کر ڈوب مریں ۔ جو کہ میں تم سے بیان کرتا ہوں ۔

س ۔ صاحب بتائیے تو وہ کیا ہے ؟

پ ۔ کیا یہ قابل نفرین نہیں کہ عوام الناس کے روبرو "ٹوپی کی صورت" کہا جاتا ہے ۔

س ۔ کیسے ؟

پ ۔ میرا دعویٰ ہے کہ ہمیں ٹوپی کی وضع کہنی چاہیئے ۔ نہ کہ ٹوپی کی صورت ۔ کیونکہ صورت ، اور وضع میں فرق ہے کہ صورت ہمیشہ جاندار چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے ، اور وضع ، بیجان چیزوں کیلئے ۔ چنانچہ حکیم ارسطو نے بھی اس کی تائید کی ہے ۔

س ۔ (ایک طرف) گھاس کہا گیا ہے (پینکریس سے) قبلہ امر زیادہ غور نہ کیجئے ۔ میں .........

پ ۔ مجھے اس قدر رنج ہے کہ میں یہ نہیں سمجھ سکتا ۔ کہ میں کیا کر رہا ہوں ۔ ؟

س ۔ صورت ، وضع اور ٹوپی کو ایک طرف رہنے دیجئے ۔ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے ۔

پ ۔ گستاخ آدمی !

س ۔ صاحب خاموش رہیئے اور .........

پ ۔ جاہل مطلق ۔

س ۔ توبہ خدایا ! میں .........

پ ۔ کتنا احمق ہے ۔ کہ اس پر اصرار کرتا ہے ۔

س ۔ وہ جھک مارتا ہے ۔ میں .........

پ ۔ ارسطو نے اسے واضح طور پر لکھا ہے ۔

س ۔ یہ صحیح ہے ۔ میں .........

پ ۔ ایک طویل بیان لکھا ہے ۔

س ۔ آپ کا خیال درست ہے (اُس طرف جا کر جہاں سے پینکریس داخل ہوا تھا)

تم بیوقوف ہو گدھے ہو کہ ایک حکیم سے بحث کرتے ہو ۔ اچھا تو یہ کام ختم ہو گیا ۔ اب ذرا میری طرف توجہ کیجئے ۔ میں آپ سے ایک مسئلہ میں مشورہ لینا چاہتا ہوں ۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں ۔ لڑکی خوبصورت اور باسلیقہ ہے ۔ اور مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہے ۔ اُس کے باپ نے بھی اجازت دیدی ہے مگر میں کچھ ایسا ہی سا خائف ہوں ۔ آپ چونکہ حکیم ہیں ۔ مجھے مشورہ دیں کہ کیا کرنا چاہیئے ؟

پ ۔ ٹوپی کی صورت کہنے کے بجائے گدھا بن جانا اچھا ہے ۔

س ۔ (ایک طرف) خدا تمہیں غارت کرے (پینکریس سے) قبلہ میں دو گھنٹے سے آپ سے مخاطب ہوں ۔ اور آپ توجہ نہیں

کرتے۔ ذرا ایک لمحہ میری بات تو سنئے۔

**پ**۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے غصہ نے مغلوب کر لیا تھا۔

**س**۔ اچھا تو اب غصہ کو تھوک دیجئے۔ اور ذرا میری عرض سنئے۔

**پ**۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

**س**۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں ........

**پ**۔ اور تم کون سی زبان استعمال کرو گے؟

**س**۔ کون سی زبان؟

**پ**۔ ہاں۔

**س**۔ زبان تو میں وہی استعمال کروں گا۔ جو میرے منھ میں ہے۔ کسی پڑوسی کی تو نہیں مانگ لاؤں گا۔

**پ**۔ میں کہتا ہوں۔ کس زبان کے محاورے اور اصطلاحات استعمال کرو گے۔

**س**۔ اوہ! تو یہ علحدہ بات ہے۔

**پ**۔ کیا تم مجھ سے اطالوی زبان میں گفتگو کرو گے؟

**س**۔ نہیں۔

**پ**۔ اسپینی؟

**س**۔ نہیں۔

**پ**۔ انگریزی؟

**س**۔ نہیں۔

**پ**۔ جرمنی؟

**س**۔ نہیں۔

**پ**۔ یونانی؟

**س**۔ نہیں۔

**پ**۔ لاطینی؟

**س**۔ نہیں۔

**پ**۔ سریانی؟

**س**۔ نہیں۔

**پ**۔ ترکی؟

**س**۔ نہیں۔

**پ**۔ عربی؟

**س**۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ فرانسیسی۔ فرانسیسی۔ فرانسیسی

**پ**۔ اچھا فرانسیسی

**س**۔ جی ہاں۔

**پ**۔ تو میرے دوسرے کان کی طرف چلے جاؤ۔ کیونکہ یہ کان صرف السنۂ علمیہ کے لئے وقف ہے۔ اور دوسرا کان گنوار زبان کے لئے ...............

**س**۔ معاملہ یہ ہے۔ کہ میں ایک خوبصورت اور باسلیقہ عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں اُسے دل سے چاہتا ہوں اُسکے باپ نے اجازت دیدی مگر ........

**پ**۔ (سنارل کی نہ سنتے ہوئے) انسان کو گویائی خیالات کا اظہار کرنے کیلئے دی گئی ہے۔ اور جس طرح خیالات چیزوں کے نمایندے ہوتے ہیں۔ اسی طرح الفاظ خیالات کے نمایندے ہوتے ہیں (سنارل بیتابی سے فلسفی کے منھ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے) مگر وہ بدستور بولنے لگتا ہے۔ جبکہ ہاتھ ہٹا دیا جاتا ہے۔ (اور یہ عمل کئی بار دھرایا جاتا ہے) اس لئے تم مجھ سے اُن الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرو۔ جو تمہارے خیالات کے بہترین نمایندے ہوں۔

**س**۔ (فلسفی کو مکان کے اندر ڈھکیل کر دروازہ بند کر دیتا ہے) خدا اس مجنون سے سمجھے۔

**پ** (مکان کے اندر) گفتگو جذبات کا آئینہ ہے۔ یعنی دل کی ترجمان اور ضمیر کا عکس۔ دلمرٹکی کھول کر بیان شدہ .........

وہ آئینہ ہے۔ جو عیاں طور پر ہمارے اندرونی۔ ذاتی اور صحیح جذبات کا صادق عکس پیش کرتا ہے۔ چونکہ تم کو عقل ودیعت کی گئی ہے۔ اس لئے تم کیوں صحیح الفاظ کی وساطت سے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتے؟

**س**۔ میں تو یہی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر تم تو کسی کی سنتے ہی نہیں۔

**پ**۔ میں سنتا ہوں۔ کہو۔

**س**۔ تو میں کہتا ہوں کہ ..........

**پ**۔ مگر ذرا مختصر کہنا۔

**س**۔ ایسا ہی ہوگا۔

**پ**۔ اور واضح طور پر۔

**س**۔ اوہ! جناب!

**پ**۔ تمام گفتگو کو ایک مجمل بیان کی صورت میں بیان کرو۔

**س**۔ میں ........

**پ**۔ کسی طرح کا ابہام وغیرہ نہیں ہونا چاہئیے (سنارل غصے میں پینکریس کے سر پر پتھر مارنے کیلئے اُٹھاتا ہے) ہیں یہ کیا؟ تم اپنا مطلب بیان کرنے کی بجائے غصہ سے مغلوب ہو رہے ہو۔ تم تو اُس گدھے سے بھی بڑھے ہوئے ہو، جو ٹوپی کی صورت، کہتا تھا۔ میں یہ ثابت کروں گا۔ اور معتبر کتابوں سے ثابت کر سکتا ہوں کہ تم حیوان مطلق ہو۔ اور میں حکیم پینکریس۔

**س**۔ کسقدر بک بک کرتا ہے؟

**پ**۔ (نیچے اُتر کر) عالم اور فاضل!

**س**۔ اور کیا؟

**پ**۔ ایک لائق اور قابل ہستی (جاتے ہوئے) تمام اخلاقی سیاسی اور طبیعی علوم کا ماہر (مڑتے ہوئے) ایک فاضل اور فاضل ترین شخصیت (جاتے ہوئے) وہ شخصیت جسے تاریخ۔ قواعد۔ شاعری۔ ریاضی۔ اور علم ہیئت پر کامل عبور ہے۔

### سنارل (تنہا)

خدا غارت کرے ان عالموں کو۔ جو کسی کی بات نہیں سنتے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ان کا پیشوا ارسطو صرف باتیں بنانی جانتا تھا۔ مجھے اب کسی اور سے ملنا چاہئیے جو اس سے زیادہ عقل رکھتا ہو۔

### مارفوریس (ایک اور فلسفی)

مسٹر سنارل تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟

**س**۔ مجھے آپ سے ایک اہم معاملہ میں مشورہ لینا ہے۔ اور میں اسی لئے آیا ہوں (ایک طرف) یہ اچھا آدمی ہے۔ کسی کی بات تو سنتا ہے۔

**م**۔ مسٹر سنارل مہربانی فرما کر اپنی طرز گفتگو کو بدلئیے۔ ہمارا فلسفہ ہم کو کسی امر کے متعلق فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ فیصلہ کو ہمیشہ معلق رکھا جاتا ہے۔ اس لئے تمہیں یوں نہیں کہنا چاہئیے۔ کہ میں آیا ہوں۔ بلکہ یہ کہنا چاہئیے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں آیا ہوں۔

**س**۔ معلوم ہوتا ہے؟

**م**۔ ہاں۔

**س**۔ بے شک معلوم تو ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا ہی ہوا ہے۔

**م**۔ یہ ضروری نہیں۔ کیونکہ بعض دفعہ جو کام ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں وہ دراصل ہوتے نہیں۔

**س**۔ یہ کیسے؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ میں آیا ہوں۔

**م**۔ یہ مشکوک ہے۔ ہمیں ہر ایک بات پر گمان نہ کرنا چاہئیے۔

**س**۔ کیا میں یہاں نہیں ہوں؟ اور کیا آپ مجھ سے نہیں

بول رہے ہ؟

م۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں ہو۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں تم سے گفتگو کر رہا ہوں۔ مگر یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

س۔ یہ کیا مذاق ہے۔ یہ میں ہوں اور وہ آپ اور معلوم ہوتا ہے، کہاں سے آگیا۔ اس بحث کو چھوڑئیے۔ اور اصل معاملہ سنئیے۔ میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔

م۔ مجھے اس کا علم نہیں۔

س۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔

م۔ ایسا ہی ہوگا۔

س۔ جس لڑکی سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ نوجوان اور خوبصورت ہے۔

م۔ ہو سکتا ہے۔

س۔ مجھے شادی کرنی چاہیئے یا نہیں؟

م۔ تمہاری مرضی۔

س۔ (ایک طرف) یہ ایک اور گدھے سے پالا پڑا ہے۔ (مخاطب ہو کر) قبلہ میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں۔ کہ میں اُس لڑکی سے شادی کروں یا نہ کروں؟

م۔ جیسا موقعہ ہو۔

س۔ کیا یہ بُرا فعل ہوگا؟

م۔ خدا جانے۔

س۔ ٹھیک طرح جواب دیجئے۔

م۔ میرا ارادہ یہی ہے۔

س۔ مجھے لڑکی سے بیحد محبت ہے۔

م۔ ہوگی۔

س۔ اُس کے باپ نے اجازت دیدی ہے۔

م۔ اُس نے ایسا کیا ہوگا؟

س۔ مگر میں شادی کرنے سے خائف ہوں۔

م۔ ہوگے۔

س۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

م۔ یہ ناممکن نہیں۔

س۔ مگر آپ اگر میری جگہ پر ہوتے۔ تو کیا کرتے؟

م۔ میں نہیں کہہ سکتا

س۔ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

م۔ جو تمہارا جی چاہے۔

س۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔

م۔ میں اس سے بری ہوں۔

س۔ خدا تم سے سمجھے۔

م۔ ایسا تو ہوگا ہی۔

س۔ (ایک طرف) کمبخت میں تجھے ابھی ٹھیک کرتا ہوں۔ (اُسے مارتا ہے)

م۔ اوہ۔ اوہ۔ اوہ۔

س۔ یہ تمہاری خرافات کا نتیجہ ہے۔ اور اب میری تسلی ہو گئی ہے۔

م۔ تم بڑے پاجی ہو۔ جو مجھ جیسے حکیم کو یوں پیٹتے ہو۔

س۔ ذرا طرز تکلم درست کرو۔ ہمیں ہر ایک امر پر گمان کرنا چاہیئے۔ یہ نہ کہو کہ میں نے تمہیں پیٹا ہے۔ بلکہ یہ کہو کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے تمہیں پیٹا ہے۔

م۔ میں تمہارے خلاف عدالت میں چارہ جوئی کرونگا۔

س۔ میں اس سے بری ہوں۔

م۔ میرے بدن پر ضربات کے نشانات ہیں۔

س۔ ایسا ہی ہوگا۔

م۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ تمہاری حرکت ہے۔

س۔ یہ ناممکن نہیں۔

م۔ میں تمہارے خلاف سمن جاری کرواؤں گا۔

س۔ مجھے اس کا علم نہیں۔

م۔ اور تم ماخوذ ہو جاؤ گے۔

س۔ ایسا تو ہوگا ہی۔

م۔ اچھا دیکھو تو (چلا جاتا ہے)

سنارل (تنہا)

اب کیا ہوگا؟ ان سوالوں سے تو کچھ بھی پتہ نہیں چلا۔ مجھ جیسا بدبخت انسان کبھی کوئی نہ ہوگا۔ میں اب تک بدستور پریشان ہوں۔ آہ یہ گنوار عورتیں آرہی ہیں۔ شاید ان سے کچھ پتہ چلے۔

(دو حبشی عورتیں ناچتی اور گاتی ہوئی داخل ہوتی ہیں)

س۔ یہ کتنی خوش ہیں۔ کیوں۔ تم مجھے کچھ میری قسمت کے متعلق بتا سکتی ہو۔

ایک عورت۔ جناب ہم دونوں بتائیں گے۔

دوسری عورت۔ ہمیں اپنا ہاتھ دکھاؤ۔ اور چاندی کا شگون کرو۔ اور ہم تمہیں سب کچھ بتائیں گے؟

س۔ یہ لو میرے دونوں ہاتھ اور چاندی۔

نمبر ۱۔ تمہاری صحت بڑی اچھی ہے۔

نمبر ۲۔ تم کچھ بننے والے ہو۔

نمبر ۱۔ تمہاری شادی عنقریب ہونے والی ہے۔

نمبر ۲۔ تمہیں ایک خوبصورت بیوی ملے گی۔

نمبر ۱۔ ایسی بیوی جسے ہر ایک چاہے گا۔

نمبر ۲۔ وہ بیوی جو تمہارے بہت سے دوست بنائیگی۔

نمبر ۱۔ وہ بیوی جو تمہارے گھر بہت کچھ لائیگی۔

نمبر ۲۔ وہ بیوی جو بہت نامور ہوگی۔

نمبر ۱۔ وہ بیوی جو تمہاری ہر جگہ عزت کرائے گی۔

س۔ یہ ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤ۔ کسی طرح کا خطرہ تو نہیں۔

نمبر ۱۔ خطرہ!

س۔ ہاں۔

نمبر ۲۔ خطرہ!

س۔ ہاں۔ کسی طرح کے فریب کا تو احتمال نہیں (وہ ناچتی اور گاتی ہیں) یہ کیا لغویت ہے۔ یہ کوئی جواب نہیں۔ جلدی کرو۔ مجھے بتاؤ۔ کہ میری بیوی مجھے کوئی فریب تو نہیں دیگی۔

نمبر ۲۔ تمہیں؟

س۔ ہاں۔ مجھے۔

(گاتی ہوئی چلی جاتی ہیں)

سنارل (تنہا)

پس اب کوئی طریقہ اس کے سوا نہیں رہا کہ میں منجم سے جا کر پوچھوں۔ اب اُس کے پاس جاؤں گا۔

ڈورمین (لائسرکاسٹ)

سنارل (پس پردہ)

ل۔ کیوں پیاری ڈورمین تمہاری سچ مچ یہی مرضی ہے۔

ڈ۔ بالکل۔

ل۔ تم ضرور شادی کروگی۔

ڈ۔ ضرور۔

ل۔ اور تمہاری برات شام کو آنیوالی ہے۔
ڈ۔ آج شام کو۔
ل۔ مگر ظالم عورت کیا تم میری محبت اور اپنے وعدوں کو بھول چکی ہو؟
ڈ۔ نہیں تو مجھے اب بھی تم سے وہی اُلفت ہے۔ اور یہ شادی اس میں حارج نہیں ہو سکتی۔ میں اس آدمی سے محبت کی وجہ سے شادی نہیں کر رہی۔ میں غریب ہوں۔ تم بھی غریب ہو۔ اور دولت کسی نہ کسی طرح سے پیدا کرنی چاہیئے۔ جب مجھے موقعہ مل رہا ہے۔ تو اس سے کیوں فائدہ نہ اُٹھایا جاوے اس بوڑھے کھوسٹ سے عنقریب نجات مل جائے گی۔ کیونکہ وہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے (سنارل کو دیکھ کر) اخاہ پیارے ہم تمہارے ہی متعلق باتیں کر رہے تھے۔ اور تمہاری بہت تعریف کر رہے تھے۔
ل۔ کیا یہی صاحب ہیں؟
ڈ۔ ہاں یہی صاحب ہیں۔ جو مجھ سے شادی کرنیوالے ہیں۔
ل۔ صاحب میری مبارکباد قبول کیجئے۔ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ ایسی عورت سے شادی کرنیوالے ہیں۔

سنارل (تنہا)

تو اب یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ مجھے اس رشتہ سے گلو خلاصی کرانی ہوگی۔ گو میرا کافی روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ مگر پھر بھی یہ کوشش کرنی ہوگی کہ رشتہ منقطع ہو جائے۔

(ایلکانسٹر کے دروازہ پر جا کر کھٹکھٹاتا ہے)

ا۔ آؤ۔ خوش آمدید۔
س۔ جناب میں۔
ا۔ کیا تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو
س۔ ہاں۔ جناب۔
ا۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟
س۔ مسٹر ایلکانسٹر یہ صحیح ہے کہ میں نے آپ سے آپ کی لڑکی کے لئے درخواست کی تھی۔ جو آپ نے منظور بھی کر لی تھی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ میری عمر زیادہ ہے۔ اس لئے رشتہ غیر موزوں ہوگا۔
ا۔ میری لڑکی تمہیں بہت پسند کرتی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے ساتھ بہت خوش رہے گی۔
س۔ میرا مزاج بہت غیر مستقل ہے۔ جو آپ کی لڑکی کیلئے تکلیف دہ ہوگا۔
ا۔ میری لڑکی مرنجان مرنج ہے۔ وہ تمہارے ساتھ اچھی طرح بسر کرے گی۔
س۔ میں جسمانی لحاظ سے بھی کمزور ہوں۔
ا۔ کوئی حرج نہیں۔ شریف بیوی خاوند کا ہر حالت میں ساتھ دیتی ہے۔
س۔ تو پھر مجھے صاف طور پر کہنا پڑے گا۔ کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔
ا۔ یقیناً تم مذاق کر رہے ہو۔ میں اپنا وعدہ توڑنا نہیں چاہتا۔
س۔ آپ تو وعدہ کو نہیں توڑ رہے ..........
ا۔ کبھی نہیں۔ چونکہ میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اس لئے تمہارا حق سب سے افضل سمجھتا ہوں۔
س۔ (ایک طرف) ارے کمبخت۔
ا۔ دیکھو میرے دل میں تمہاری بہت عزت ہے۔ اور اب اگر مجھ سے شہزادہ بھی درخواست کرے۔ تو میں تمہیں ترجیح دوں گا۔
س۔ میں آپ کی عزت افزائی کا ممنون ہوں۔ مگر میں

یہ شادی نہیں کر سکتا۔

ا۔ شادی نہیں کر سکتے؟

س۔ نہیں۔

ا۔ مگر کیوں نہیں؟

س۔ کیوں؟ کیونکہ میں اپنے آپ کو شادی کا اہل نہیں سمجھتا اور دوسرے میں اپنے باپ اور دوسرے بزرگوں کی تقلید کرنا چاہتا ہوں۔ جنھوں نے شادی نہیں کی تھی۔

ا۔ خیر یہ ہر ایک کا اپنا مذاق ہے۔ میں کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ چونکہ تم اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ اس لئے میں دیکھتا ہوں کہ اس کے متعلق کیا کیا جا سکتا ہے؟ میں ابھی آتا ہوں۔

## سنارل (تنہا)

اب راہ راست پر آ رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ مجھے بہت تکلیف اُٹھانی پڑے گی۔ میں وہ قدم اُٹھانیوالا تھا جو بہت مضر ثابت ہوتا۔ اب اُس کا بیٹا آ رہا ہے۔ شاید کوئی جواب لایا ہے۔ ایلیڈاس! (نہایت نرمی سے) جناب آپ کا خادم۔

س۔ جناب میں خود آپ کا خادم ہوں۔

ایل۔ میرے باپ نے مجھے بتایا ہے کہ آپ رشتہ واپس لینا چاہتے ہیں۔

س۔ ہاں جناب مجھے بہت افسوس ہے۔ مگر......

ایل۔ اوہ! اس میں کوئی حرج نہیں۔

س۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور میری خواہش......

ایل۔ خیر اسے جانے دیجئے۔ یہ لیجئے (سنارل کو دو تلواریں دیتا ہے) ان میں سے ایک لے لیجئے۔

س۔ ان میں سے ایک تلوار؟

ایل۔ ہاں۔ بشرطیکہ آپ پسند کریں۔

س۔ کس لئے؟

ایل۔ جناب چونکہ آپ میری بہن سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔ اس لئے یہ کرنا ہوگا۔

س۔ یہ کیا؟

ایل۔ دوسرے لوگ آپ سے بے طرح لڑتے۔ مگر ہم سب کام باقاعدہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے آیئے ایک دوسرے کا گلا کاٹیں۔

س۔ یہ بہت برا ہے۔

ایل۔ مگر آپ کو کرنا ہوگا۔

س۔ میں آپ کا خادم ہوں۔ مگر میرا گلا کٹنے کے قابل نہیں (ایک طرف) دیکھئے۔ یہ ایک اور گدھے سے پالا پڑا ہے۔

ایل۔ مگر جناب یہ ہو کر رہے گا۔

س۔ نہیں صاحب مجھے یہ منظور نہیں۔

ایل۔ جلدی کیجئے۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔

س۔ مگر میں یہ کام نہیں کر سکتا۔

ایل۔ تو آپ لڑینگے نہیں؟

س۔ نہیں بالکل نہیں۔

ایل۔ (بید سے سنارل کو پیٹتا ہے) آپ شکایت نہیں کر سکتے یہاں ہر ایک کام باقاعدہ ہوتا ہے۔ اگر آپ تلوار نہیں اُٹھاتے تو آپ کو پٹنا ہوگا۔

س۔ (ایک طرف) عجیب احمق سے پالا پڑا ہے۔

ایل۔ (دوبارہ تلوار دیتے ہوئے) آیئے مردانگی کا ثبوت دیجئے پیشتر اس کے کہ میں آپ کے کان کھینچوں۔

س۔ کیا؟ تم نے واقعی تہیہ کرلیا ہے؟

ایل۔ جناب میں کسی کو مجبور نہیں کرتا یا آپ کو شادی کرنی ہوگی اور یا تلوار چلانی پڑے گی۔

س۔ جناب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا غلام دونوں میں سے کچھ بھی نہیں کرسکتا۔

ایل۔ واقعی؟

س۔ واقعی!

ایل۔ معاف فرمائیں...... (دوبارہ پیٹتے ہوئے)

س۔ اوہ۔ اوہ۔ اوہ۔

ایل۔ جناب میں آپ سے یہ سلوک کرنے پر مجبور ہوں۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو میں آپ کو یونہی پیٹتا چلا جاؤں گا۔ حتی کہ آپ شادی کرنے پر رضامند ہو جائیں۔

س۔ تو میں شادی کرنے کیلئے تیار ہوں۔ میں ضرور شادی کروں گا۔

ایل۔ میں یہ دیکھکر بہت خوش ہوا ہوں کہ آپ کے حواس کا اختلال درست ہوگیا ہے۔ یقین جانئے میرے دل میں آپ کی بہت عزت ہے۔ آپ ذرا انتظار کریں۔ میں باپ کو بلاتا ہوں۔

(باہر جاکر باپ کو بلاتا ہے)

ایل۔ ابا جان۔ یہ صاحب اب شادی کرنے پر رضامند ہیں وہ یہ تہیہ کرچکے ہیں۔

ایلکالنسٹر۔ جناب یہ لیجئے۔ اس کا ہاتھ۔ اب یہ آپ کی ملکیت ہے۔ اور میں اس بلا سے نجات پا چکا ہوں۔ آیئے نغمۂ شادی گائیں۔

(گاتا)

نسیم رضوانی

# ترجمہ تاریخ ادب اردو

چھپ کر تیار ہوگیا جس سے زیادہ مکمل اور جامع زبان اردو کی کوئی تاریخ نہیں۔ تمام مشاہیر نظم و نثر کے تذکرے اونکے کلام کے نمونے اور سو کے قریب مشہور ادیبوں کی تصاویر مع ایک زبردست انڈکس کے اس میں شامل ہیں۔ بہت ضخیم ہے۔ دو حصہ مجلد نہایت خوشخط چھپائی وکاغذ نہایت دیدہ زیب قیمت (لعہ) مترجمہ مرزا محمد عسکری صاحب بی۔اے۔

**تذکرۃ الخواتین** تمام شاعرہ عورتوں کی نہایت مختصر سوانحعمری اونکا کلام۔ حالات۔ ایرانی اور ہندوستانی دونوں جگہ کی صنف نازک کے کلام کا بےمثل اور لاجواب مجموعہ۔ اس سے زیادہ مواد اس بارہ میں کسی تذکرہ نسواں میں نہ ملے گا۔ مولفہ مصور درد مولوی عبدالباری صاحب آسی قیمت عہ چھپائی وکاغذ نہایت عمدہ۔

**مینیجر نولکشور پریس صیغہ بکڈپو، لکھنو**

# چند دن پشاور میں

## عبرت و بصیرت کے چند لمحات نہیں

سنتے ہیں کہ ہر شخص کے ساتھ ایک فرشتۂ رحمت ہوتا ہے جو اُس کے لئے اسباب خیر فراہم کرتا رہتا ہے۔ اور ایک فرشتۂ شر (شیطان) ہوتا ہے جو انسان کو تباہیوں کی طرف دعوت دیتا رہتا ہے۔ مجھے خیر، اپنے اس دوسرے محترم رفیق کا تو علم نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟ اور کہاں نہیں؟ لیکن اپنے ایک اول الذکر فرشتہ کا حال ضرور معلوم ہے جو ڈیرہ اسماعیل خاں میں رہتا ہے اور جس کا نام اخوند فیض محمد ہے[1]۔ یوں تو میری اور اخوند صاحب کی قابل ذکر شناسائی اول اول اس وقت ہوئی تھی جب میں زمیندار کے اڈیٹوریل اسٹاف میں (غالباً [illegible]) شامل تھا۔ لیکن حقیقی تعلق کی تاریخ اب سے نو سال قبل اجراء نگار کے وقت سے شروع ہوتی ہے، جب میں بھوپال میں تھا اور وہ اپنے وطن ڈیرہ اسماعیل خاں میں۔ پھر اس کو میری کشش صادق کہئے یا انکا شوق فراواں کہ یہ بُعد مکانی بھی ایک بار مٹ کر رہا۔ اور انھوں نے از راہِ کرم بھوپال تک آنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اور آخر کار یہ فرشتہ بالکل اسی طرح میرے سامنے مجسم آگیا جس طرح بلاتشبیہ دحیۂ کلبی کی صورت میں رسول کو نظر آیا تھا۔

شروع سے اس وقت تک جناب اخوند صاحب نگار اور اس کے مقاصد کے ساتھ جسقدر دلچسپی لے رہے ہیں اسکی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ لیکن مختصراً اس قدر بیان ضروری ہے کہ صوبۂ سرحد میں نگار کی مقبولیت انھیں کی ممنون کرم ہے اور انھیں کے لطف و خلوص نے اس کا ایک وسیع حلقہ وہاں کے ارباب علم و ادب اور اصحاب جاہ و ثروت میں پیدا کیا۔ رہا یہ امر کہ وہ اسقدر

---

[1] اخوند صاحب کے اسلاف کا وطن صوبۂ قندہار ہے اور آپ کے جد اعظم اخوند فضل علی فاروقی وہاں قاضی القضاۃ اور شاہزادگان کے معلم و اتالیق تھے۔ لیکن بعد کو سیاسی حالات کے بناء پر قندہار چھوڑنا پڑا اور نواب شیر محمد خاں فرمانروائے ڈیرہ اسماعیل خاں نے انکو وزارت کا عہدہ تفویض کیا۔ بعد کو جب ڈیرہ اسماعیل خاں پر برطانیہ کا تسلط ہوا تو یہ خاندان ریاست بہاولپور سے متوسل ہو گیا لیکن وطنی تعلقات وہیں رہے، چنانچہ ہمارے اخوند صاحب بھی ڈیرہ اسماعیل خاں میں رہتے ہیں اور خاندانی عظمت و وقار کو قائم رکھتے ہوئے۔ حد درجہ ممتاز زندگی بسر کر رہے ہیں۔

رافت و شفقت سے کیوں کام لے رہے ہیں۔ اس کا سبب (اگر واقعی نگار اس قابل نہیں ہے کہ وہ کسی صاحب ذوق کو اپنا بنالے) سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ وہ بھی خصوصیت کے ساتھ ویسے ہی بد ذوق واقع ہوئے ہیں جیسا میں اور میرا نگار۔

گزشتہ اگست میں غالباً اسی قسم کی کوئی علمی یا ادبی صحبت پشاور میں برپا تھی کہ اخوند صاحب نے پھر اپنی "ملکوتیت" سے کام لے کر میرا اور نگار کا ذکر شروع کر دیا اور مذہب کے باب میں میرے مقالات و خیالات پیش کر کے ایسی گرمی محفل پیدا کر دی کہ آغاز اکتوبر میں مجھ کو وہاں دعوت دئے جانے کی تجویز آخر کار طے کرنا پڑی۔ اکتوبر کی تعیین ایک تو اس لحاظ سے تھی کہ موسم خوشگوار ہوگا، دوسرے اس سبب سے کہ اگست میں وہاں کی سیاسی فضا بھی اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنیکی اجازت نہ دے سکتی تھی۔

لیکن مجھ کو اطلاع اس وقت ملی جب میں ستمبر میں کشمیر جانے کے لئے اپنا پروگرام مرتب کر چکا تھا، اور یہ ممکن نہ تھا کہ میں ستمبر میں کشمیر رہوں اور اکتوبر میں پشاور۔ کیونکہ اتنا طویل زمانہ اپنے مستقر سے باہر رہ کر بسر کرنا کاروبار کے انتظامی حالات کے لحاظ سے محال تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ آیا "سیہ چشمان کشمیری" زیادہ قابل ترجیح چیز ہیں یا "کلہ پوشان افغانی"۔ لیکن چونکہ کشمیر کی سیاحت اس سے قبل کر چکا تھا، اس لئے مجھے فیصلہ کرنے میں زیادہ دشواری نہ ہوئی۔ اور میں نے اطلاع دیدی کہ

کیست آں جانے بتابد سر ز فرمان شما

لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب وہاں کے سیاسی کوائف درست نہ تھے۔ اور اس لئے معناً میرا یہ سفر منحصر تھا۔ اس توقع پر کہ اکتوبر تک وہاں کے حالات اعتدال پذیر ہو جائیں گے۔ گو کسی قدر میں اس فلسفۂ اعتدال کے خلاف تھا۔ تاہم قضیۂ بر سر زمین "طے کرنیوالوں کے مصالح کے خلاف میں کیا کہہ سکتا تھا۔

آخر کار شروع اکتوبر تک میرے امن پسند دوستوں کے نقطۂ نظر سے وہاں امن ہو گیا اور تار کے ذریعہ سے اِدھر اُدھر دعوت کے توثیق و قبول کا مرحلہ طے ہو کر میں ۱۶ اکتوبر کو یہاں سے روانہ ہو گیا۔ لیکن یہ بھی قدرت کی عجیب کار فرمائی تھی کہ ایک ہفتہ قبل جب مجھے تار بھیجا گیا تو وہاں کامل امن و سکون تھا۔ لیکن میرے پہونچتے پہونچتے دفعتاً صورت حالات بالکل بدل گئی اور پہلے سے بہت زیادہ خطرات کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ پہلا شگون نیک تھا جس کا کچھ علم تو پہلے ہی اخبارات کے ذریعہ سے ہو گیا تھا اور پوری طرح اس وقت جب میں ۱۷ کی رات کو دس بجے پشاور چھاؤنی اسٹیشن پر پہونچا اور سب سے پہلے پلیٹ فارم پر رسم خیر مقدم ادا کرنیکے بعد یہی خبر مجھکو سنائی گئی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس خبر سے جو مسرت مجھے حاصل ہوئی اُس کے چھپانے میں مجھے کامیابی ہوئی یا نہیں، لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ میں احباب کے اس اظہار تاسف کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ نہ ہو سکا، اور اس لئے ممکن ہے کہ انھوں نے میری بے حسی کا کچھ اندازہ کر لیا ہو۔

ہر چند گاڑی رات کو کچھ ناوقت پہونچی، لیکن جناب سردار احمد خاں صاحب سول جج پشاور جناب خان بہادر رسالدار مغل باز خاں صاحب (جو پہلے چیف کمشنر صوبۂ سرحد کے پرسنل اسسٹنٹ تھے اور اب قبائلی سیاسیات کے مدیر و مہتمم ہیں) جناب رائے بہادر لالہ دینا ناتھ صاحب گیریزن انجنیئر، جناب دیوان شیو چرن لال صاحب افسر خزانہ اور جناب اخوند فیض صاحب نے (جو محض میری وجہ سے تقریباً ایک ہفتہ قبل یہاں تشریف لے آئے تھے،) اسٹیشن پر میری پذیرائی کی زحمت گوارا فرمائی اور اس طرح میں اس نئی سرزمین کے نئے انسانوں کی پُرخلوص معیت میں جناب سردار احمد خاں صاحب کے بنگلہ پر پہونچا، جہاں میرا قیام تجویز کیا گیا تھا۔

یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ کسی نئی جگہ پہونچنے سے قبل وہاں کی جغرافی، تمدنی و عمرانی حالت کا نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کر لیتا ہے، اور پھر وہاں پہونچنے کے بعد اپنے قیاسات کو حقیقتوں سے موازنہ کرکے دیکھتا ہے کہ اس کے تصور نے کتنی غلطیاں کی تھیں، پھر اکثر و بیشتر نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اس کو اپنے قائم کئے ہوئے نقوش ایک ایک کرکے سب محو کر دینے پڑتے ہیں۔ اور ان کی جگہ دوسرے نقوش کو دینی پڑتی ہے جو کہ توقع کے لحاظ سے کبھی کم اور کبھی زیادہ دلکش ہوتے ہیں۔ لیکن مجھ کو ایسا اتفاق بہت کم ہوتا ہے۔ اس لئے میں اس حیثیت سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں سمجھتا قصہ مختصر یہ کہ پشاور کو میں نے ویسا ہی پایا جیسا سمجھ چکا تھا اور بہت کم اپنی پیش بینیوں میں مجھے اصلاح کرنا پڑی۔

پشاور اور صوبۂ پشاور کے ساتھ میری دلچسپی نہ وہاں کی آبادی سے متعلق تھی جو حکومت برطانیہ کے زیر اثر اپنی تمام آزادانہ خصوصیات کو عرصہ ہوا محو کر چکی ہے، اور نہ وہاں کی خوش گوار آب و ہوا سے کہ اس لحاظ سے بہتر مقامات میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ بلکہ وہ متعلق تھی صرف اس خیال سے کہ اس کے جوار میں کچھ قومیں اب بھی ایسی آباد ہیں جو صحیح معنے میں آزادی کی لذت سے آشنا ہیں، اور جو باوصف حد درجہ بے سروسامانی کے، علم و حکمت کی تمام ہلاکت باریوں اور خاراشگافیوں کا مقابلہ کرنے میں کبھی اپنے آپ کو درماندہ و عاجز نہیں پاتیں۔ پھر اسی کے ساتھ یہ خیال کہ پشاور آخری حد ہے حکومت برطانیہ کے فیوض و برکات کی اور اس کے بعد ہی دنیا کا وہ مشہور ترین درۂ خیبر شروع ہو جاتا ہے جو تاریخ نوع انسانی سے لیکر اس وقت تک بے شمار واقعات انقلاب و حوادث اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، بہت زیادہ معاون تھا میرے شوق کی فراوانی میں جو اس وقت تک بدقسمتی سے پورا نہ ہو سکا تھا۔

پشاور و حدود پشاور فی الحقیقت نام ہے اس وسیع وادی کا جو ہمالیہ کے دامن میں کسی وقت بحر آسا جھیل کی صورت رکھتی تھی۔ لیکن اب بقول غالب "بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا" اُس نے خشک ہو کر اپنے بیابان میں ایک وقت غیر معلوم سے اس انسانی آبادی کو جگہ دے رکھی ہے۔ جسے اگر صوبۂ سرحد کا قلب و دماغ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یہیں صوبہ کے فرمانروا کا نشیمن ہے۔ اور اسی مقام سے صوبہ کے اکثر وہ افراد متعلق ہیں جو دولت و امارت، جاہ و ثروت یا تعلیم و سیاست کے لحاظ سے کوئی نہ کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہر چند میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ اگر کسی وقت ہندوستان کے دوسرے

صوبوں کی طرح اس صوبہ کو بھی نظم ونسق کے خود مختارانہ اختیارات تفویض کئے گئے، تو اس کا امتیاز اس صوبہ کی آبادی کے کس جذبہ کو دیا جائے گا۔ آیا وہ جو موجودہ حالات سیاست کے ماتحت وہاں کے علمبرداران حریت اور اپنی جانوں کی قربانیاں کرنے والوں کی طرف سے ظاہر ہوا ہے۔ یا وہ جو حد درجہ امن وسکون کے ساتھ سر عبدالقیوم خاں کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے "دیار محبوب" کی طرف لے گیا ہے۔

صوبۂ سرحد کے تقریباً تمام اضلاع کو ہمالیہ اپنے نیم قوسی دائرہ کی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ اور اس لئے اس صوبہ کی سیاسیات اُن آزاد قبائل کی وجہ سے جو ہندوستان اور کابل کے درمیان ان پہاڑوں کے غاروں اور دروں میں آباد ہیں۔ زیادہ اہم ہوگئی ہے۔ اور ہونا چاہئیے۔ کیونکہ اندرون ملک میں حکومت کا واسطہ ایکطرف ان تعلیم یافتہ، متمدن ومہذب لوگوں سے ہے جو اپنے جذبات کے اظہار میں صرف زبان وقلم کو جنبش میں لا سکتے ہیں۔ اور دوسری طرف تعلق اُن جاہلوں اور وحشیوں سے ہے۔ جنھوں نے تمام آئین انسانیت میں سے صرف ایک یہ اُصول اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے کہ شاہد آزادی کے لئے جان دینا اولین نذر ہے جو انسان کی طرف سے پیش کیجا سکتی ہے۔ یعنی اگر ایک طرف وہ جماعت ہے جو اپنے عرض حال کے لئے

ماایم و سرشکے کہ چکیدن نتواند،

سے زیادہ کوئی اور تعبیر وتفسیر نہیں رکھتی تو دوسری طرف وہ گروہ ہے جس کے جنون کو

دستے کہ بجز جامہ دریدن نشناسد

کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پھر اگر ان دونوں کے فرق وامتیاز کو دیکھنا ہے تو سرحد جائیے اور اس حزم واحتیاط، اس نظم واہتمام کو دیکھئے جو برطانیہ الیسی عظیم المرتبت حکومت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ میدانوں میں، دروں میں، پہاڑوں پر، سڑکیں ہیں، ریلیں ہیں، فوجیں ہیں، توپ خانے ہیں، ہوائی جہاز ہیں، پھٹنے والے بم ہیں، خاردار تاروں کے حصار ہیں، نعائم ولذائذ کے انبار ہیں، اور ہر وہ چیز ہے، جو اس دور علم وحکمت میں قدرت کے سامنے چیلنج کے طور پر پیش کیجا سکتی ہے؟ اور کس کے مقابلہ میں؟ ان چند ہزار وحشی وخانماں برباد نفوس کے مقابلہ میں، جن کی زندگیاں ناہموار غاروں میں، پتھروں کی چٹانوں پر بسر ہوگئی ہیں، جو برفباری کی صعوبتوں، گرمی کے شدائد کا مقابلہ صرف اپنے جسم کی عریانی سے کرتے ہیں، جو علم وحکمت کی ترقیوں سے بالکل بیخبر ہیں۔ اور جن کا آزوقۂ جنگ سوائے اُن دو خشک روٹیوں یا چند مٹھی آٹے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ جسے اُن کی مائیں، بہنیں اور بیویاں آخری ہدیۂ محبت کی صورت میں اُن کی جھولی میں ڈال کر خدا کے سپرد کر دیتی ہیں۔

---

جس وقت میں وہاں پہونچا تو حکومت اور آفریدی جماعت کے درمیان کشیدگی پیدا ہو چکی تھی، جرگوں کی طیاریاں ہو رہی تھیں اور جمرود میں دونوں فریق کے نمایندوں کا اجتماع ہو رہا تھا۔ نزاع یہ تھی کہ برطانیہ کی فوجیں کھجوری میدان

تک بڑھ گئی تھیں۔ جو قبائلی علاقہ میں شامل ہے اور آفریدی جماعت اس مداخلت کے خلاف برہم تھی۔ اِس طرف سے اس اقدام و مداخلت کا سبب یہ بیان کیا جاتا تھا کہ چونکہ انھوں نے گزشتہ اگست میں پشاور تک اپنی تاخت کو بڑھا دیا تھا۔ اس لئے آئندہ کے لئے پشاور کو اس خطرہ سے بچانے کے لئے فوجوں کو آگے بڑھا دینا اور کھجوری میدان پر قبضہ کر لینا ضروری ہے۔ اس کا جواب آفریدیوں کی طرف سے یہ دیا جاتا تھا کہ حکومت نے سیاسی مظاہرات پر جو سلوک اہل پشاور کے ساتھ کیا تھا اُس کا اقتضاء یہ تھا کہ ہم ان کے ساتھ ہمدردی کرتے، اُن کا حال دریافت کرتے اور اگر اس سلسلہ میں بعض غیر ذمہ دار نوجوانوں کی طرف سے حملہ یا تاخت کی صورت پیدا ہو گئی تو اس کا ذمہ دار تمام قبیلہ یا جماعت کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ رہا یہ امر کہ آئندہ کیلئے امن سکون کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے تو اس کے لئے ہمارا وہ مطالبہ موجود ہے جو لاکھوں کی تعداد میں حکومت کی طرف سے سڑکوں کے معاوضہ میں دیا جاتا ہے اور جس کو عہد شکنی کی صورت میں ہر وقت ضبط کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سب سی وقت ممکن ہے اور گفتگوئے مصالحت اس شرط سے ہو سکتی ہے کہ پہلے اُن فوجوں کو ہٹا لیا جائے جو کھجوری میدان میں آ کر ہمارے حصۂ زمین پر قابض ہو گئی ہیں۔

آفریدیوں کے نمایندوں سے حکومت کا پولیٹکل اسٹاف جس میں ہمارے محترم دوست خان بہادر رسالدار[1] مغل باز خاں درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتے تھے، مصروف گفتگو تھا، اور ہمارے رسالدار صاحب جو قدرت کی طرف سے نہایت سوچنے والا، فلسفیانہ دماغ لیکر آئے ہیں، اپنی تمام قوت اس کوشش میں صرف کر رہے تھے کہ آفریدی جماعت اپنا سر اُس قوت سے نہ ٹکرائے جو اُن کے مقابلہ میں ایک کوہ گراں کی حیثیت رکھتی ہے، چیف کمشنر، وائسرائے اور وزیر ہند کے درمیان لاسلکی رابطۂ گفتگو ہر وقت جاری تھا، فوجیں اپنی طیاریوں میں مصروف تھیں۔ شہر کی آبادی نتیجہ کی منتظر تھی، اور ہر زبان روز ایک نئی پیشین گوئی بیان کر رہی تھی کہ صورتیں بن بن کر بگڑیں، فضا صاف ہو ہو کر ابر آلود ہوئی اور آخر کار آفریدیوں کی جاہل و وحشی قوم نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا کہ:-

"اگر اتنی زبردست سلطنت کا ہم ایسے خستہ جانوں کے مقابلہ میں آنا باعث ننگ نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس چیلنج کو اپنے لئے باعث فخر نہ سمجھیں۔ کیونکہ قوت کی طرف سے ترکِ رواداری گویا ضعیف کو دعوت قربانی دیدینا ہے۔ پھر جب خانماں بربادی یقینی ہے اور جان دینا اٹل، تو پس و پیش کیسا؟ اسلئے آپ کھجوری میدان پر شوق سے قبضہ کر لیجئے لیکن کم از کم یہ حق ہمیں ضرور حاصل ہونا چاہیئے کہ سپرد کرنے سے قبل ایک بار ہمکو اسکو اپنے سیلاب خون سے رنگین بنا کر ہمیشہ کے لئے خیرباد کہیں۔"

پشاور سے تقریباً ۶ میل جانب مغرب و جنوب حکومتِ ہند کے حدود ختم ہو کر قبائل کی سرزمین شروع ہو جاتی ہے۔

---

[1] رسالدار صاحب موصوف خود بھی آفریدی ہیں۔ اور بڑا زبردست اثر اس جماعت پر رکھتے ہیں۔

"نگار" لکھنؤ

جیسے دس میل سے لیکر بیس میل تک کا وسیع وہموار حصہ وادی سمجھنا چاہیئے۔ اس کے بعد ہمالیہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اور وہ پیچ در پیچ بلندیاں نظر آتی ہیں، جن کے اندر ایبٹ آباد سے لے کر ڈیرہ اسماعیل خاں تک ایک نیم دائرہ کی صورت میں اقوام سوات وبنیر، مہمند، آفریدی، اورکزئی، وزیری اور محسود آباد ہیں اور جن میں کسی نہ کسی ایک قوم کا صوبہ سرحد کی حکومت سے برسرپرخاش رہنا ضروری ہے۔ کھجوری میدان اس سے قبل حقیقتاً آفریدیوں کے قبضہ میں تھا، اور اس کو زیادہ تر چراگاہ کی صورت سے استعمال کرتے تھے۔ چونکہ آفریدی قوم ایک ہجرت کرنوالی قوم ہے جو برفباری کے زمانہ میں پہاڑوں کو چھوڑ کر میدان میں آجاتی ہے اور پشاور و حدود پشاور میں مزدوری کرکے زندگی بسر کرتی ہے، اس لئے وہ کھجوری میدان کو اپنی سرمائی قیام گاہ بھی سمجھتے ہیں۔ اور کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے۔ کہ اس کو برطانیہ کے فوجی قبضہ میں دیدیں۔ الغرض میرے سامنے ہی جرگے ختم ہو گئے۔ اور حکومت برطانیہ کی طرف سے اُن کو چند گھنٹوں کا نوٹس دیدیا گیا کہ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کو محفوظ مقامات میں لیجائیں ورنہ ہوائی جہازوں کی تاخت سے اُن کو نقصان پہونچنے کا احتمال ہے۔ اس کے بعد وہ تیراہ چلے گئے جو خاص انکا مرکز ہے اور ہر چند اس کے بعد کبھی کبھی رات کو توپوں اور بندوقوں کی آوازیں دونوں فریق کے درمیان گفتگوئے مصالحت کے انقطاع سے مجھے خبردار کرتی رہیں لیکن کوئی قابل ذکر مقابلہ یا تصادم نہیں ہوا، گو پشاور میں روزانہ عجیب و غریب مبالغہ آمیز خبریں مشہور ہوتی تھیں، جو فوجوں کی نقل و حرکت اور حفاظت پشاور کے انتظامات کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں کے نزدیک قابل یقین بھی ہوتی تھیں۔

آفریدی قوم اس وقت تقریباً ۶۰ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان میں کم از کم ۴۰ ہزار ایسے افراد ہیں جو پوری عسکری قوت کے ساتھ میدان میں آسکتے ہیں۔ رائفلوں اور کارتوسوں کی ان کے پاس کمی نہیں۔ قدر اندازی انکا فطری جوہر ہے جسے ہر آفریدی بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے لیکر پیدا ہوتا ہے، جان لینا اور دیدینا اُن کے نزدیک ایسا ہی فطری تقاضہ ہے جیسے مطالعۂ کتاب کے وقت اس کے اوراق اُلٹتے رہنا۔ قوت جسمانی کے لحاظ سے وہ صحیح معنے میں ہرقلس کی اولاد ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں اور چٹانوں پر وہ اس طرح آسانی کے ساتھ دوڑتے پھرتے ہیں گویا نشیب و فراز کا کوئی مفہوم ہی انکے یہاں نہیں ہے، جنگ کے دوران میں وہ اکثر شبخونوں سے کام لیتے ہیں، اور جب وقت دست بدست لڑائی ہوتی ہے تو خود اپنے سینہ کے اندر فریق ثانی کی سنگینوں کو تیرا کر خود بھی ہلاک ہو جاتے ہیں اور اُس کو بھی ہلاک کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی قوم ان صفات وخصوصیات کی چاروں طرف دروں، پہاڑوں، خندقوں اور غاروں میں پھیلی ہوگی تو اس کی مخالفت کس درجہ امن شکن ثابت ہوگی، اور ایک ایسی سلطنت کو جو صلح و جنگ دونوں حالتوں میں ایک خاص اسلوب وآئین کی پابند ہے کس قدر گھبرانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ شخص جو پشاور سے لنڈی خانہ تک گیا ہو دیکھ سکتا ہے کہ درۂ خیبر کے استحکامات کتنے زبردست ہیں اور صرف ۲۷ میل تک ریل لیجانے میں جو ۳۲ سرنگوں میں سے گزر کر گئی ہے چودہ کروڑ روپیہ صرف کردینا کوئی بے معنی بات نہیں ہوسکتی۔ جگہ جگہ پہاڑوں پر قلعوں کے استحکامات ریل کے ساتھ ساتھ سڑک کی تعمیر جو

ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی ہمالیہ کی بلندی پر چلی گئی ہے، بلند چوٹیوں تک فوجوں کے لئے بجلی کی روشنی اور آبرسانی کا وافر انتظام، درۂ خیبر کے دونوں طرف مسلح خاصہ داروں[۱] کا قیام، جگہ جگہ بلندیوں پر اوٹ پوسٹ اور تمام استحکامات کا باہمدگر لاسلکی سے مربوط ہونا، یہ وہ تمام مناظر ہیں، جس سے اگر ایک طرف برطانیہ قوم کی حزم و احتیاط، خوبی نظم و اہتمام پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف درۂ خیبر کی اہمیت و عظمت بھی سامنے آجاتی ہے کہ باوجود اُن تمام احتیاطوں اور پیش بینیوں کے اب بھی قبائل کے لئے سینکڑوں ہزاروں مواقع اس کے اندر ایسے پائے جاتے ہیں کہ اگر وہ تمام ترقی یافتہ آلات حرب سے آراستہ ہوں تو حکومت کے یہ تمام استحکامات نسیج عنکبوت سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان درۂ خیبر دیکھنے کے بعد ہی اس حقیقت کو جان سکتا ہے کہ جس قوم کے پاس یہ قدرتی ذریعۂ دفاع موجود ہو اور جو حکومت اس پر اقتدار کامل حاصل کرلے وہ نصف ایشیا کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔

یہی وہ درہ ہے جس سے عہد قبل تاریخ میں قدیم آریہ قوم وسط ایشیا سے ہندوستان آئی، یہی وہ مقام مرور ہے جس سے اسکندر کی فوجیں گزر کر ٹکسیلا تک آئیں، یہی وہ تاریخ عالم کا اہم ترین راستہ ہے جس نے تیمور، بابر، محمود، اور تمام سلاطین فرغانہ و افاغنہ کی فوجوں کو اپنی آغوش میں جگہ دی۔ تاریخ ماضی کے اوراق ایک ایک کرکے میری نگاہوں کے سامنے آرہے تھے، درۂ خیبر کی ایک ایک چٹان زبان حال سے افسانۂ ماضی دہرارہی تھی، اور جمرود کے وسیع میدان کا ایک ایک ذرہ بتارہا تھا کہ یہی وہ وادی ہے جہاں اس سے قبل ملوک قدیم کی فوجیں درہ کی صعوبتوں سے گزرنے کے بعد رات کو اپنی خستگی دور کیا کرتی تھیں

میں اسی خیال میں مستغرق تھا کہ سامنے کابل کا ایک قافلہ نظر آیا۔ جو وہاں کی مختلف قسم کی پیداوار اونٹوں و خچروں پر لادے ہوئے اسی وادئی جمرود سے گزر رہا تھا۔ یہ لوگ اس سنگلاخ درہ کو پیادہ پا طے کرکے آرہے تھے، لیکن نہ چہروں پر اضمحلال تھا، نہ اعضا میں خستگی کا نشان، حسین و جمیل عورتیں جن میں بعض بہت نازک تھیں، اس استواری قدم کے ساتھ چل رہی تھیں جو ہمارے یہاں مردوں کا بھی حصہ نہیں، چھوٹے چھوٹے بچے جو گرد آلود پھول کی طرح نظر آرہے تھے اس طرح گزر رہے تھے گویا وہ ابھی ابھی کھیلنے کو باہر نکلے ہیں۔ میں نے ایک چھوٹی لڑکی کو دیکھا جو بہت ہی نازک تھی اور اپنی کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے چل رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ شاید یہ زیادہ خستہ ہوچکی ہے، لیکن اُس کے چہرہ کی شگفتگی کہہ رہی تھی کہ اگر وہ خستہ ہے تو بھی اس خستگی سے مسرور ہے۔ یہ ہیں وہ خصوصیات جو ایک آزاد قوم کے فلاکت زدہ افراد میں بھی پائی جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد آب و ہوا میں خشک نان جویں سے پیدا ہونے والا ایک قطرۂ خون کہیں زیادہ قیمتی و اہم ہے تولید دم کی اس زیادتی سے

---

[۱] خاصہ دار اُس بے ضابطہ آفریدی فوج کا نام ہے جو حکومت کی مشاہرہ یاب ہے اور جس کے سپرد درہ کی حفاظت ہے خاصہ داروں کے علاوہ آفریدی جماعت کے متعدد سردار و خوانین بھی حکومت کی طرف سے معقول مشاہرہ پاتے ہیں جنکو ملک کہتے ہیں اور یہی لوگ انکی نمایندوں کی حیثیت سے گفتگو کرتے ہیں۔

جس کے لئے غلاموں کے فربہ جسم میں ہر سال نشتر فصاد چبھونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ قافلہ جمرود کی کاروانسرائے پر رات کو قیام کرے گا، اور صبح کو پشاور میں اپنا مال فروخت کرکے پھر واپس آجائے گا۔ خدا جانے کتنی قومیں اس سنگستان کی ایسی ہیں جو وقت نامعلوم سے اسی طرح مرفحل زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اور جن کی حیات عبارت ہے اُس رات سے جس میں وہ تھک کر چٹانوں پر یا فرش زمین پر بیہوش سو جاتے ہیں۔ یا اُس دن سے جس کا مفہوم اُن کے یہاں "بر بندید محملہا" سے زیادہ کچھ نہیں۔ انسان خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے، علم و حکمت، دولت و امارت کتنا ہی سامان آسائش و تن پروری کا کیوں نہ فراہم کرلے لیکن روح جس کے لئے تڑپ سکتی ہے وہ یہی وحشت ہے، جو فطرت کی سادہ لیکن پُر از آب و رنگ آغوش میں حقیقی درس حریت آزادی کا دیتی ہے۔

---

چونکہ گفتگوئے صلح کے انقطاع کے بعد ہر وقت آفریدیوں کے تاخت کا امکان تھا اور وہ سڑکیں جو ان کے علاقوں سے ہو کر گزرتی ہیں خطرناک ہو گئی تھیں، اس لئے پشاور سے کوہاٹ جانیوالی سڑک زیادہ مخدوش ہو گئی تھی۔ کیونکہ یہ سڑک خاص اُس درہ سے ہو کر گزرتی ہے جو تیراہ سے قریب تر ہے اور جس پر امن شکنی کے زیادہ امکانات تھے اس لئے میزبان عزیز جناب سردار احمد خانصاحب متامل تھے کہ میں اُس سڑک سے گزروں، لیکن جب اُنھوں نے مجھے زیادہ بیتاب پایا تو درہ کے ایک آفریدی ملک کو طلب کرکے مجھے ان کے سپرد کیا اور اُنھوں نے ایک غیر یقینی وعدہ (کیونکہ جو وعدہ انشاءاللہ کے ساتھ شروع ہو وہ ہمیشہ غیر یقینی ہوتا ہے) مجھکو صحیح و سلامت واپس لانے کا کرکے مجھے اپنے ساتھ موٹر پہ لے لیا، جناب اخوند فیض محمد صاحب فاروقی بھی میرے ساتھ تھے۔ ہر چند ملک صاحب کی معیت جو اپنے علاقہ تک سڑک اور درہ کی حفاظت کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں اور جن کے پاس ہر وقت ایک پستول معہ درجنوں کارتوسوں کے آتش فشانی کے لئے تیار رہتا ہے، کافی اطمینان بخش بات تھی، لیکن میرا اطمینان ان میں سے کسی چیز سے متعلق نہ تھا، بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ اس وقت اطمینان یا امن و سکون کا سوال ہی میرے سامنے نہ تھا تو زیادہ موزوں ہوگا۔

پشاور سے چل کر ۵-۶ میل کے بعد حدود برطانیہ ختم ہو گئے اور اسی کے ساتھ وہ مناظر عسکری بھی اوجھل ہو گئے جو فوجی چوکیوں اور خیمہ زن فوجوں کی صورت میں سڑک پر اور میدانوں میں نظر آرہے تھے۔ اب میں ایک آزاد علاقہ میں تھا۔ اُس فضا میں تھا جو اس وقت تک غلامی کی سانس سے زہر آلود نہیں ہوئی تھی۔ میدان میں سڑک کے دونوں جانب کھیت تھے، چراگاہیں تھیں، جا بجا آفریدیوں کے گاؤں تھے، اُن کی حسین عورتیں تھیں، ان کے معصوم بچے تھے اور وہ خود تھے۔ جن کی بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی ایک منٹ کے لئے کبھی ان سے جدا نہیں ہوتی۔ ان کی نگاہیں غور سے ہمیں دیکھتی تھیں لیکن ملک صاحب کو دیکھکر جو آگے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مطمئن ہو جاتی تھیں۔ میدان ختم ہونیکے بعد وہ درہ شروع ہوا جس میں اس وقت تک خدا جانے کتنے واقعات قتل و خونریزی کے جذبۂ انتقام فرو کرنے کے لئے ہو چکے ہیں اور ایک گھنٹہ کے

اندر ہم ملک صاحب کے گاؤں میں پہونچ گئے، جہاں صرف ایک اُنھیں کا مکان عمران و تمدن کا پتہ دینے والا تھا۔ ملک صاحب نے مجھے دکھایا کہ کس طرح یہاں ہر ہر گھر رائفل بنانے کا مستقل کارخانہ ہے، اور یہ کہ اُن کی تیار کی ہوئی رائفلیں کس قدر نفیس ہوتی ہیں۔ ایک تیار رائفل میرے سامنے لائی گئی تو میں دیکھکر حیران رہگیا اور کسی طرح باور کرنے کو جی نہ چاہتا تھا کہ یہ ولایتی نہیں ہے۔ درہ کوہاٹ کے سڑک پر جتنے گاؤں ہیں سب آفریدی علاقہ کے ہیں، اور ان سب میں رات دن سوائے رائفل سازی کے اور کوئی کام نہیں ہوتا، کہیں نالیں بن رہی ہیں، کسی جگہ ان پر پالش ہو رہی ہے، کہیں اجکٹر (EJECTOR) تیار ہو رہا ہے، اور کسی جگہ کندے بن رہے ہیں، الغرض جس مکان کو جاکر دیکھئے، وہاں سوائے اس مشغلہ کے اور کچھ نہ پائے گا اور ہر ہاتھ مظاہرہ شجاعت کی امداد میں کسی نہ کسی حیثیت سے مصروف کار نظر آئے گا۔

اس گاؤں میں ایک مدرسہ بھی ہے جہاں اُردو کی تعلیم ہوتی ہے، ملک صاحب کے عزیزوں میں سے کسی کا ایک چھوٹا بچہ موجود تھا۔ میں نے کتاب منگواکر اُس کا سبق سُنا اور اُسکی پشتو بولنے والی زبان سے اردو کے ٹوٹے ٹوٹے لفظ سُن کر عجیب لطف آیا۔ معلوم ہوا کہ جس طرح پشاور سے لنڈی خانہ تک جوار کے گاؤں والوں کو اخلاقی طور پر ممنون کرنے کے لئے کسی سے ریل کا کرایہ آج کل نہیں لیا جاتا، اسی طرح یہاں کا مدرس بھی حکومت سے تنخواہ پاتا ہے۔ جس سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ حکومت ہند صلح و آشتی کا ہر ممکن طریقہ اس قوم کے ساتھ استعمال کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اس قوم کی وحشت کا وہی عالم ہے اور اس کی آزادی کا کسی قیمت پر بھی خریدا جانا ممکن نہیں۔

ان کی عورتوں میں پردہ برائے نام ہے اور وہ نہایت آزادی سے باہر نکل کر اپنے کاموں میں مصروف دیکھی جاتی ہیں۔ ان کا لباس سیاہ دوپٹہ اور سیاہ شلوار ہے جو ان کی دہقانی خاک آلود زندگی کے لحاظ سے غالباً زیادہ موزوں ہے، اور ممکن ہے اس انتخاب میں کوئی جمالیاتی پہلو بھی اُن کے رخ و سفید رنگ کے لحاظ سے پنہاں ہو۔

---

میرے پروگرام میں کوہاٹ، بنوں، اور ڈیرہ اسماعیل خاں کا جانا بھی شامل تھا، لیکن کچھ تو سیاسی اضطراب کی وجہ سے احباب نے مخالفت کی اور کچھ اسوجہ سے کہ سردار محمد نواز خانصاحب بھی یہیں خیبر ایجنسی میں رسالدار مغل باز خانصاحب کی عیادت کے لئے طلب کر لئے گئے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ کوہاٹ اور بنوں کی سیاحت بغیر ان کی موجودگی کے کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ ہر چند مجھے حد درجہ افسوس ہے کہ پروگرام کی اس تبدیلی سے میں نہ ملک خدابخش صاحب گورنمنٹ پلیڈر ڈیرہ جات سے مل سکا اور نہ خانصاحب نوابزادہ سردار اسد اللہ خانصاحب رئیس کلاچی سے، اسی طرح نہ مولوی نور بخش صاحب بی اے وکیل ڈیرہ اسماعیل خاں کی زیارت ہوسکی اور نہ کوہاٹ کے دیگر احباب کی جن سے بہت قدیم غائبانہ تعارف مجھے حاصل ہے، لیکن شکر ہے کہ اس فروگذاشت یا نامساعدت بخت کی تلافی ایک حد تک یوں ہوگئی کہ سردار محمد نواز خانصاحب اتفاق سے پشاور آگئے اور اس طرح مجھے اُس ہستی کا شرف دید و ملازمت حاصل ہوگیا، جو تمام صوبہ سرحد میں اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے گل سرسبد

کی حیثیت رکھتی ہے۔

---

چودہ دن کے قیام پشاور میں جن حضرات نے غایت لطف و کرم سے کام لے کر میرے مطالعہ کو کامیاب بنانے کی کوشش کی، ان میں سب سے زیادہ مہتم بالشان وجود جناب نواب سر دوست محمد خاں صاحب رئیس تاکال کا ہے، جنھوں نے مجھے یہ دیکھنے کا موقعہ دیا کہ رؤسا پشاور کس فراخدلی کس علوئے حوصلہ سے دعوت کرتے ہیں۔ نواب صاحب ممدوح یہاں کی وہ مخصوص ہستی ہیں جن پر حکومت و پبلک دونوں کا کامل اعتماد ہے اور جن کے علوئے اخلاق سے ہر شخص متاثر ہے۔ افسوس ہے کہ نواب صاحب کی علالت مزاج کی وجہ سے زیادہ موقع تبادلۂ خیالات کا نہیں ملا۔ ایک دن رئیس موضع چمکنی کے یہاں بھی تقریب شادی کے موقعہ پر شرکت ضیافت کی فرصت نصیب ہوئی اور اس طرح مجھے یہاں کے گاؤں اور وہاں کی معاشرت غیر عمرانی دیکھنے کا بھی موقعہ ملا۔ پشاور بڑا شہر ہے، تجارت کی وجہ سے دولتمند بھی ہے، مسلمانوں کی حالت اچھی ہے، لیکن حفظان صحت کی طرف سے محکمۂ بلدہ کو مطلق توجہ نہیں۔ کیسا اچھا شہر، کسقدر عمدہ آب و ہوا کتنی دلکش آبادی، لیکن گندگی اس قدر! یہ ہے نتیجہ اس نظم و آئین کا جس نے اتنے عرصہ تک اس صوبہ کو خود مختارانہ حقوق سے علیحدہ رکھا، اور یہاں کے دماغوں میں اصلاح و تنظیم کی اہلیت پیدا نہ ہونے دی۔

اسلامیہ کالج میں بھی دوبار جانے کا اتفاق ہوا اور قریشی صاحب (اسسٹنٹ سکریٹری) کے ساتھ بھی چند لمحے یہاں کی خوش گوار و صحت بخش ہوا میں صرف کرنے کی توفیق میسر آئی۔ کالج آبادی سے تقریباً ۵ میل دور واقع ہے اور اپنے نظم و اہتمام تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اچھی شہرت رکھتا ہے۔

---

میں جسوقت لکھنؤ سے روانہ ہوا تو موسم گرم تھا، لیکن پشاور پہونچتے پہونچتے کافی سرد ہو گیا اور اخیر اکتوبر تک اتنی سردی ہو گئی کہ آج ۲۰ر نومبر تک بھی یہاں اس کا پتہ نہیں۔ موسم کی دلکشی کے لحاظ سے میں لنڈی خانہ کا وہ ایک دن مشکل سے فراموش کر سکوں گا، جب ٹھیک دوپہر کو بلند چوٹیوں سے آنیوالی خنک ہوا پنے سے ترشح کے ساتھ جسم کے اندر پیوست ہوئی جا رہی تھی اور میں اُس کا مقابلہ کرنے کی خواہش بھی اپنے اندر نہ پاتا تھا۔ میں دیر تک پہاڑ کے ایک غار میں جو غالباً کسی وقت کسی انسان کا مسکن رہا ہوگا اور بہت بلندی پر واقع تھا بیٹھا رہا اور چاروں طرف سنسان منظر کا خاموش مطالعہ کرتا رہا۔

---

جن حضرات نے میری پذیرائی کی تھی، انھیں نے ۳۰ر کی رات کو مجھے رخصت کیا اور ۳۱ر کو بہت صبح میں پشاور سے روانہ ہو کر یکم نومبر کو لکھنؤ پہونچ گیا۔ میں اپنے جذبات منت پذیر کا تفصیلی بیان

مناسب نہیں سمجھتا، کیونکہ نہ وہ حضرات اس کو پسند کرتے ہیں جن سے وہ متعلق ہیں، اور نہ میں زیادہ چنیں وچناں کا عادی ہوں، لیکن اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ ان احباب کے لطف وکرم نے میرے اندر یہ خواہش ابھی سے پیدا کر دی ہے کہ آیندہ موسم بہار میں اسی وحشی سرزمین میں چند راتیں اپنی زندگی کی پھر بسر کروں، جس کی وحشت پر علم و تہذیب کے ہزار دن قربان ہیں۔

---

# نگار کا نیا سال

## اور

# ناظرین نگار

(۱) یہ پرچہ اٹھارویں جلد کا آخری پرچہ ہے اور آیندہ پرچہ جنوری ۳۱ء کا تقریباً دوچند ضخامت کا ہوگا۔ جسکی خوبی کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ اسمیں آپ کو ایک مستقل کتاب **فراست التحریر** پر ملیگی جس میں ایک شخص کے صرف سواد خط کو دیکھکر اسکی سیرت اور اُسکے مستقبل پر آپ آسانی سے حکم لگا سکینگے اردو میں اس موضوع پر یہ بالکل پہلی کتاب ہے۔ علاوہ اسکے حضرت نیاز کا ایک نہایت معرکتہ الآرا افسانہ "**داستان حسن و عشق کا ورق خونین**" اور **مجنون گورکھپوری** کا ایک بالکل نیا افسانہ "**خواب خیال**" شائع ہوگا۔ اسی کے ساتھ ایک درحد درجہ دلچسپ بحث علماء ہند کے اُن فتاویٰ پر ہوگی جو مولانا نیاز کے استفسار و استفتاء پر انکی طرف سے موصول ہوئے تھے۔

اس لئے ظاہر ہے کہ آپ ایسے مفید و دلکش مجموعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دینگے۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو کیوں نہ آپ نگار کا چندہ نئے سال کا پہلے ہی سے ذریعہ منی آرڈر روانہ کر دیں اور وی پی کے فضول مصارف سے بچیں۔

**مینجر نگار**

# سید سلیمان ندوی کی طرف سے جواب

کسی صاحب نے ماہ اکتوبر کے رسالہ نگار میں بعنوان "مولانا سید سلیمان ندوی اس کا جواب دیں کہ کیا واقعی احادیث کی کوئی دینی قیمت ہے؟" ایک مضمون شائع کیا ہے۔ جس میں اپنے آپ کو عامل بالقرآن ظاہر کرتے ہوئے احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق یہ دعوے کیا ہے کہ:۔

احادیث کی کوئی دینی قیمت نہیں اور حدیثوں کو ہم دینی حجت نہیں مانتے

احادیث شریفہ کو دینی حجت تسلیم نہ کرنیکی جسقدر وجوہ بیان کئے ہیں ان سب کا لب لباب یہ بیان کیا ہے کہ:۔

"بخاری یا مسلم سے روایت کرنے میں لازم تھا کہ اس روایت کے دو شاہد عادل ہوتے پھر وہ راوی جس سے روایت کرتا ہے اُسکے بھی دو گواہ معتبر درکار تھے اس اصول کے مطابق آپ کے پاس ایک حدیث بھی ہے راوی ایک حدیث بیان کرتا ہے وہ خود ہی مدعی ہے کہ میں نے یہ حدیث فلاں سے سنی پھر وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس سے اسکو فلاں نے بیان کیا۔"

اس گمراہ کن مضمون کی حقیقت سے مسلمانوں کو متنبہ کر دینا چونکہ ہر ایک سچے عامل بالقرآن کا فرض ہے اس لئے اسی اصول مخترعہ کو کہ جسے حق اور ناحق کے امتیاز کا معیار مقرر کیا ہے پیش نظر رکھتے ہوئے اوسکے ادعائے ناروا کی حقیقت سے مسلمانوں کو مطلع کرتا ہوں کہ حفظ ایمان کا ذریعہ ہو۔ اس منکر حدیث کے اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا قرآن کو خالص دین قرار دینا اور اپنے متعلق عامل بالقرآن ہونے کا دعوے کرنا بچند وجوہ بالکل غلط اور مغالطہ سے خالی نہیں ہے۔ پہلے یہ کہ احادیث شریفہ کو دینی حجت تسلیم کئے بغیر قرآن پر عمل دشوار اور غیر ممکن ہے۔

دوسرے یہ کہ جب اُس کے اُصول مخترعہ کے اعتبار سے احادیث دینی حجت نہیں بن سکتیں تو بعینہ یہی سوال قرآن پاک کے متعلق بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ قرآن جس پر عامل ہونے کا اسکو دعویٰ ہے اگر وہی قرآن ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا تھا تو اس قرآن پر عمل کرنے والون کو احادیث کو دینی حجت تسلیم کرنا لازمی اور فرض ہے۔ اس لئے کہ اس قرآن کا رسول اللہ پر نازل ہونے کا علم اور یقین اسکو

یا تو قول رسولؐ یا قول صحابی سے یا خود خداوند جل وعلا کے قول سے حاصل ہوا ہے۔ اگر قول رسول علیہ السلام سے حاصل ہے تو حدیثیں دینی حجت ہوئیں اور اگر قول صحابہ سے حاصل ہے تو اقوال صحابہ بھی دینی حجت ہوئے اور اگر قول خداوند جل وعلا سے حاصل ہے تو اس قول خداوندی کی تصدیق کہ واقعی یہ قول خداوندی ہے رسولؐ کے قول سے ہونی لازمی اور ضروری ہے۔ اس لئے کہ قرآن پاک کی جن آیتوں میں خداوند جل وعلا نے رسول اللہ کو اپنا رسول اور ان پر قرآن کے نازل ہونیکو بیان کیا ہے۔ درحقیقت ان آیتوں کو خدا نے رسول اللہؐ کے ادعائے رسالت اور اس دعوے کی کہ خدا نے مجھ پر قرآن نازل کیا ہے اثبات اور استشہاد میں نازل کی ہیں۔ تو پہلے یہ ثابت ہو جانا ضروری ہے کہ رسولؐ نے اپنے متعلق خدا کے رسولؐ اور اپنے اوپر قرآن کے نازل ہونے کا دعویٰ کیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ واقعی رسولؐ کا ادعائے رسالت اور اپنے اوپر خدا کی طرف سے نزول قرآن کا دعویٰ صحیح ہے اگر ایسا نہ ہو تو بہت بڑا اعتراض یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ رسول تو یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں اور مجھ پر خدا کا کلام نازل ہوتا ہے مگر جس کے رسولؐ ہونے کا اور اپنے اوپر جسکے کلام کے نزول کا مدعی ہے۔ اوسکی طرف سے رسولؐ کے دعوے کے ثبوت کی کوئی حجت نہیں۔ اسی طرح قرآن کا تو دعویٰ ہے کہ خدا نے مجھکو اپنے فلاں رسولؐ پر نازل کیا ہے اگر قرآن کے اس دعوے کی تصدیق اوس رسول کے قول سے نہ ہو تو قرآن کا اپنے دعوے میں جھوٹا ہونا لازم آئیگا۔ غرضکہ قرآن کے اس دعوے کی کہ مجھکو خدا نے فلاں رسول پر نازل کیا ہے یا خود خداوند جل وعلا کے اس دعوے کی کہ میں نے یہ قرآن اپنے فلاں رسول پر نازل کیا ہے۔ تصدیق اور ثبوت اس رسولؐ کے قول سے ضروری ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن پاک کی تمام آیتوں کے منزل من اللہ اور منزل علی رسولہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کی تصدیق اور ثبوت قول رسولؐ سے لازمی اور ضروری ہے اگر قرآن پاک کی تمام آیتوں کے منزل من اللہ اور منزل علی رسولہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کی تصدیق اور ثبوت قول رسول ضروری اور لازمی نہیں ہے تو نعوذ باللہ قرآن پاک کا مرتبہ طلسم ہوشربا کے دفتر سے زیادہ نہیں ہو سکتا ہے اور جو لوگ کہ قرآن کی تحریف کے مواقع کے متلاشی رسول اللہ کے وقت سے لیکر آج تک ہیں ان لوگوں کو کھلا ہوا میدان مل جاتا جسطرح چاہتے نظم قرآن میں اپنی ریشہ دوانی کر کے اپنے دل کے حوصلے نکال لیتے۔ پس جبکہ قرآن کے کلام خداوندی ہونے اور اس پر ایمان رکھنے کا دارومدار رسول ہی کے قول پر ہے۔ تو اب اقوال رسول یعنے احادیث کو دینی حجت نہ ماننے والوں کے منکرین قرآن ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ لہذا اسی عامل بالقرآن کے مدعی کے لئے احادیث کے دینی حجت ہونے کو تسلیم کرنا لازمی اور ضروری ہے۔ مگر چونکہ یہ احادیث مدونہ فی الکتب اس کے اصول مخترعہ کے اعتبار سے ناقابل حجت ہیں۔ تو کم از کم اپنا ہی ایمان درست کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ جس قرآن کے عامل ہونے کا مجھکو دعویٰ ہے یہ وہی قرآن ہے جو رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے ایک ہی ایسی روایت پیش کرے جسنے ایک دوسرے سے دو شاہد عادل کے سامنے روایت کرتے ہوئے اپنی سلسلۂ روایت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہونچایا ہو۔ ورنہ اس عامل بالقرآن پر ایک ایسی چیز کا ایمان رکھنے اور ایسی چیز کے

قرآن ہونیکے اعتقاد رکھنے کا الزام عائد ہوگا جس کا قرآن ہونا ظنی اور غیر یقینی ہے۔ اور اگر وہ قرآن جس پر عامل ہونے کا اُس کو دعویٰ ہے منزل علیٰ رسولہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہے تو اس کا احادیث کے دینی حجت ہونے کو نہ تسلیم کرنیکا دعویٰ بالکل صحیح اور درست ہے۔

تیسری یہ کہ کل قرآن پاک کا نزول بہ یک وقت نہیں ہوا ہے بلکہ حالات اور واقعات کے بموجب اس کا نزول تدریجاً ہوا ہے اور اسکے اندر جسقدر احکامات بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض مجمل۔ بعض محکم۔ بعض متشابہات بعض ناسخ بعض منسوخ۔ بعض ماؤل۔ بعض مفسر ہیں اگر یہ مدعی عمل بالقرآن احکامات کو دینی بات سمجھتا ہے اور اپنے اصول مخترعہ کے بموجب احادیث مدونہ فی الکتب کو واقعی دینی حجت نہیں تسلیم کرتا ہے تو ان احکامات قرآنیہ کے سمجھنے کا اس کے پاس کونسا ذریعہ ہے اگر کوئی ایسا مدعی عمل بالقرآن جو احادیث کو دینی حجت نہیں تسلیم کرتا ہے حسب ارشاد قرآنی اقیمو الصلوٰۃ نماز پڑھنے کے لئے جائے۔ تو اس کو کیسے معلوم ہوگا کہ مجبورات اور دن کے اندر کون کون وقت نماز پڑھنی چاہیئے اور کون وقت کتنی رکعتیں نماز فرض ہیں اور کتنی واجب۔ صحت نماز کے لئے کیا کیا شرائط ہیں۔ ارکان نماز میں سے کون کون ارکان فرض ہیں اور کون کون واجب۔ پس ان تمام دینی باتوں کا معلوم کرنا احادیث کو بغیر دینی حجت تسلیم کئے غیر ممکن اور محال ہے اس لئے کہ قرآن پاک نے مسائل جزئیہ کو نہیں بیان کیا ہے ممکن ہے کہ کسی منکر حدیث کے ذہن میں یہ آئے کہ جب قرآن نے نماز کا حکم دیا ہے تو نماز کے متعلق جسقدر مسائل جزئیہ ہیں قرآن کے اسی کلیہ اقیمو الصلوات کے اندر داخل ہیں اور رسول نے قولاً اور فعلاً اسی کلیہ کی تفصیل کردی ہے تو اندریں صورت بھی اولاً اس کو حدیث کے دینی حجت ہونیکو تسلیم کرنا پڑے گا اور ثانیاً قول رسول کو۔ جو غیر قرآنی ہے قرآن ہونا تسلیم کرنا پڑے گا۔

احادیث کے دینی حجت ہونے کو منکرین ہی کی شان میں آیت شریفہ وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ نازل ہوئی ہے۔ اس لئے کہ دین کی جس قدر باتیں خدا نے اپنے رسول کو تبلائیں اور رسول نے ان دینی باتوں کی اشاعت فرمائی دو قسم ہیں ایک تو۔ وہ باتیں ہیں کہ خدا نے بمعرفت جبرئیل وحی بھیجکر تبلائیں اور متلو فی القرآن ہیں۔ دوسری قسم کی وہ باتیں ہیں کہ خدا نے دوسرے فرشتہ کی معرفت سے وحی بھیجکر یا بلا واسطہ کسی فرشتہ کے خود خدا نے رسول پر وحی بھیجکر یا جبرئیل کی معرفت وحی بھیجکر تبلائیں مگر متلو فی القرآن نہیں ہے۔ وہ دینی باتیں جو وحی کی پہلے قسم سے متعلق ہیں قرآن کہلاتا ہے اور جن باتوں کو وحی کے دوسرے قسم سے تعلق ہے قول رسول اور حدیث کہلاتی ہیں۔ اگر منکرین حدیث اسی آیت شریفہ پر نظر غور ڈالکر سوچیں تو خود انکو باحسن وجوہ معلوم ہو جائے گا کہ درحقیقت احادیث کی واقعی دینی قیمت ہے اور حدیثیں دینی حجت ہیں۔ اور مدعی عمل بالقرآن کے لئے حدیثوں کو دینی حجت تسلیم کرنا اور سمجھنا لازمی ہے۔ اور اس منکر حدیث نے۔ حدیثوں کے دینی حجت ہونیکے انکار میں جو یہ بیان کیا ہے کہ :-

اہل سنت کی سب سے بڑی دلیل حدیثوں کو تسلیم کرانے کے لئے یہ ہے کہ قرآن میں حکم ہے۔ اطیعوا اللہ و

اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ کہتے ہیں کہ جبتک حدیثیں تسلیم نہ کیجائیں رسول کی اطاعت کیونکر ہو سکتی ہے اسکے دو جواب ہیں ایک الزامی دوسرا تحقیقی۔ الزامی جواب یہ ہے کہ اطاعت رسول کے ساتھ ساتھ امرائے اسلام کی بھی اطاعت کا بھی حکم ہے آپ نے احادیث رسول کے دفاتر تو تیار کر لئے۔ لیکن امرائے اسلام کی احادیث کے مجموعے کیوں نہ بنائے کہ دین کا جزو ہوتے۔ کیونکہ بلا ان کی احادیث کے ان کی اتباع کیونکر ہو سکتی ہے؟

درحقیقت ان پر حجت ہے۔ اس لئے کہ اطاعت رسول حسب ارشاد قرآنی۔ جب فرض ہے تو رسول کے افعال اور اقوال کے مطابق اپنے افعال اور اقوال کو درست کرنا ضروری ہے اور قرآن نے کل افعال اور اقوال رسول کو۔ بیان نہیں کیا ہے۔ بلکہ اگر معمولی غور و فکر سے یہ منکر حدیث کام لے تو۔ خود ان کو حدیثوں کے دینی حجت ہونے کا اقرار کرنا پڑے اس لئے کہ جس طرح اطاعت رسول حدیثوں کو دینی حجت تسلیم کئے بغیر غیر ممکن اور محال ہے۔ اسی طرح اطاعت الٰہی بھی حدیثوں کو دینی حجت سمجھے بغیر غیر ممکن ہے اور ان تمام لوگوں کا جو صحیح معنی کے ساتھ مدعی عمل بالقرآن ہیں یہی مذہب ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ امرائے اسلام کی اطاعت کے لئے انکی احادیث کے مجموعے بنائے جائیں عقل سلیم کا کام نہیں ہے امرائے اسلام کی اطاعت کے لئے ان کی حدیثوں کے مجموعے بنانے کی ضرورت درحقیقت انہی عامل بالقرآن کو ہے جو حدیثوں کے دینی حجت ہونیکے منکر ہیں۔ اور جو عامل بالقرآن احادیث رسول کے دینی حجت ہونیکے معتقد ہیں انکو امرائے اسلام کی احادیث کی کیا ضرورت ہے رسول نے خود تمام باتوں کو بالتفصیل بیان فرما دیا ہے۔ مگر منکر احادیث کے پاس قرآن کے اس حکم پر عمل کرنیکا کون سا ذریعہ ہے۔ اولی الامر سے کون امرائے اسلام مراد ہیں۔ اور ان کی اطاعت کا کیا مطلب ہے اگر یہ منکر حدیث احادیث کے دینی حجت ہونے کا انکار نہیں کرتا تو آیات قرآنیہ کے معنی اور مطالب میں تحریف کی جرات نہیں کر سکتا فافہم وتدبر ولا تکون من الذین ضلوا فاضلوا۔

اب اس منکر حدیث کے تحقیقی جواب کو بھی ملاحظہ فرمادیں لکھتا ہے:-

تحقیقی جواب یہ ہے کہ اطاعت رسول کو ہم بھی فرض سمجھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں لیکن رسول کی اطاعت یہی کہ جو پیغام وہ حق کی طرف سے لایا ہے اور جسکی اتباع وہ خود کرتا ہے اس کی پیروی کی جائے۔

اگر درحقیقت یہ منکر حدیث اطاعت رسول کو فرض سمجھتا اور اس پر ایمان رکھتا تو حدیثوں کے دینی حجت ہونیکا انکار ہرگز نہیں کرتا۔ اس لئے کہ جب یہ خود کہہ رہا ہے کہ رسول کی اطاعت یہی ہے کہ جو پیغام وہ حق کی طرف سے لایا ہے اور جس کی اتباع وہ خود کرتا ہے اسکی پیروی کی جائے اس کے اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کی اتباع جس طرح سے رسول نے کی ہے کرنیکا نام اتباع رسول ہے۔ اگر کسی نے۔ قرآن کی اتباع بعینہٖ جسطرح کہ رسول نے کی ہے نہیں کی تو وہ شخص متبع قرآن نہیں کہلا سکتا ہے پس اتباع قرآن کے لئے حدیثوں کے دینی حجت ہونے میں بھی اب کلام کی گنجائش نہیں ہے اس لئے

یہ معلوم کرنا کہ رسول نے قرآن پاک کی کس آیت کا کیا مطلب سمجھا اور اس پر کس طرح عمل کیا ہے متبعین قرآن کے لئے ضروری ہے بغیر اسکے قرآن پر عمل کرنے کا دعویٰ کرنا۔ ضلالت اور خارج عن الاسلام ہونے کا پیش خیمہ اور اپنے کو خدا کا دشمن بنانا ہے۔

علاوہ بریں اس منکر حدیث کے علمی معلومات کا جب یہ حال ہے کہ قرآن پاک کے آسان سے آسان لفظوں کے بھی صحیح معنی سمجھنا اس کے لئے محال ہے تو۔ اپنی علمی لیاقت سے قرآن پاک کی ان آیتوں کو کہ جن کے متعلق خود خدا کا ارشاد ہے ہوالذی انزل علیک الکتب منہ ایات محکمات ھن ام الکتب واخر متشابھات فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ کل من عند ربنا وما یذکر الا اولو الالباب حدیثوں کو دینی حجت تسلیم کئے بغیر کیا سمجھ سکتا ہے۔ بالخصوص اس منکر حدیث کی جیسی علمی حالت ہے خود آیت شریفہ ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم کے ترجمہ میں اپنے سے ظاہر کردی ہے اس آیت کے ترجمہ میں لکھتا ہے۔

بعض لوگ حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں کہ لوگوں کو بلا علم کے گمراہ کریں۔

جب اس منکر حدیث کو لھو الحدیث اور مطلق حدیث۔ اور حدیث رسول کے معنی اور اُسکے درمیان فرق وامتیاز کی طاقت نہیں تو۔ ایسے شخص کا حدیثوں کے دینی حجت ہونے کو تسلیم نہیں کرنا اپنے سے اپنے کو چاہ ضلالت میں ڈھکیلنا نہیں ہے تو اور کیا اور شیر ودیانت اور تقویٰ کا یہ حال کہ محض اپنے ادعائے باطل کو ثابت کرنے کیلئے قرآن کے لفظ اور معنی میں تحریف کرنے میں۔ نہ خداوند قہار کی قہاریت اور نہ قرآن پاک کی عظمت اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت کا خیال ہے۔ احادیث رسول کے دینی حجت ہونیکو نہیں تسلیم کرنیکی اثبات میں اس آیت شریفہ کو پیش کرنا اور لھو الحدیث کا معنی۔ حدیث رسول مراد لینا۔ اور اس پر عامل بالقرآن ہونے کا دعویٰ کرنا۔ اس منکر حدیث کی ایمانی حالت کا بے مثل خاکہ ہے۔ خدا اور اسکے رسول اور خدا کے کلام کی عظمت اور اہمیت کو پیش نظر رکھکر ایمان سے کام لے کر اس آیت شریفہ کے ترجمہ لکھتے وقت کم از کم قرآن پاک کے کسی آسان سے آسان اردو ترجمہ کو دیکھ لیتا تاکہ من فسر القرآن برأیہ فلیتبوأ مقعدہ فی النار کے وعید سے تو محفوظ رہتا۔ رسول کی احادیث کے مشغلہ کا خریدار ہونا ایمان اور سعادت مندی کا وسیلہ ہے۔ ہاں یہی منکر حدیث اور انھیں کے جیسے لوگوں کے جھوٹ موٹ اور مزخرفات سے ایمانداروں کو دور رہنے کی ہدایت اور تاکید اس آیت شریفہ میں کی گئی ہے۔ اور بتلا دیا ہے کہ یہ منکر حدیث عامل بالقرآن ہونیکے جھوٹ دعویٰ کرنے والا جھوٹ اور من گڑھت باتوں کے ذریعہ سے مسلمانوں کو گمراہ کرنیکی کوشش کر رہا ہے۔ گمراہ اور جاہل ہے۔

**محمد یوسف رشیدی**

---

(نگار) یہ نمونہ ہے مولویوں کی مربوط ومدلل تحریروں کا جو کبھی کبھی ہمیں موصول ہو جاتی ہیں، اگر سارا مضمون پڑھنے کے بعد آپ کسی نتیجہ تک نہیں پہونچ سکتے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو بھی الہامی نہ کہیں کیونکہ جس طرح کلام مجید بغیر احادیث کی مدد کے نہیں سمجھ سکتے اسیطرح یہ مضمون بھی عام فہم انسانی سے اسقدر بلند ہے کہ جب تک خود اسکا لکھنے والا آ کر نہ سمجھائے کوئی مفہوم پیدا کرنا مشکل ہے

# باب الاستفسار

## نفس و روح

(جناب سید علی متقی صاحب - حیدر آباد)

کیا آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ نفس انسانی و روح میں کوئی فرق ہے اور اگر کوئی فرق نہیں ہے تو کلام مجید میں روح اور نفس کا علٰحدہ علٰحدہ ذکر کیوں آیا ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں علٰحدہ ہیں تو ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ یعنی مرنیکے بعد نفس باقی رہتا ہے یا روح

موت کے بعد بقاء روح کی صورت کیا ہے اور کلام مجید میں جو روح انسانی کی حقیقت "قل الروح من امر ربی" کہکر بتائی گئی ہے وہ نفس انسانی سے متعلق نہیں ہو سکتی۔ الغرض میں نفس و روح کا فرق اور بقاء روح کی بابت آپ کے خیالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

---

(نگار) آپ کا استفسار بہت دلچسپ لیکن بہت تفصیل کا محتاج ہے اگر میں اس مسئلہ میں تمام اکابر کے خیالات پیش کروں۔ لیکن چونکہ میں کسی اور کی رائے سے استناد نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ خود اپنی رائے اس باب میں ظاہر کروں گا، اس لئے غالباً زیادہ شرح وبسط کی ضرورت نہ ہوگی۔ البتہ آپ کے سوالات کی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھوں گا اور عمومی طور سے اس مسئلہ پر اس طرح اظہار خیال کرونگا کہ آپ کے سوالات کا جواب کسی نہ کسی طرح آجائے خواہ ترتیب کچھ ہو۔

قرآن میں نفس و روح دونوں لفظ آئے ہیں، لیکن قبل اس کے کہ قرآنی مفہوم سے بحث کیجائے ان دونوں الفاظ کے لغوی معنی معلوم ہو جانا چاہئیے۔

لفظ نفس عربی زبان میں مونث و مذکر دونوں مستعمل ہوتا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ جب وہ مونث استعمال ہوتا ہے تو اکثر و بیشتر اس کے معنے روح یا جان کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ خرجت نفسہ روح یا جان نکلنے کے محل پر بولتے ہیں اور جب وہ مذکر استعمال ہوتا ہو تو اس سے مراد ذات یا شخص ہوتی ہے۔ نفس کے معنے مقصد و ارادہ کے بھی

آتے ہیں، خون کے معنے میں بھی یہ لفظ مستعمل ہے اور جسم کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ اسی طرح عظمت، ہمت، اور رائے کا مفہوم بھی اسی لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے،

روح کے معنے عربی میں اس چیز یا کیفیت کے ہیں جس سے حیات قائم رہتی ہے اور وحی والہام کے معنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

یعنی لغوی لحاظ سے نفس کا لفظ زیادہ وسیع المعنی ہے جس میں روح کے معنے بھی شامل ہیں اور لفظ روح سے وہ تمام معنے ظاہر نہیں کئے جاتے جو نفس کے ماتحت ہم نے ابھی ظاہر کئے۔

اب قرآن کو دیکھئے کہ اس میں یہ دونوں الفاظ کہاں اور کن معنے میں استعمال کئے گئے ہیں۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے کلام مجید میں لفظ نفس (باوجود اس کے کہ وہ مونث استعمال ہوا ہے) ہر جگہ ذات، ضمیر، جنس اصلی، جوہر اور نوع کے معنے میں آیا ہے اور لفظ روح الہام ووحی، فراست وذکاوت، قوت استعلا یا استعداد ترقی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی قرآن میں کسی جگہ نہ لفظ نفس بول کر اور نہ لفظ روح کہہ کر وہ روح مراد لی گئی ہے، جس کے متعلق بقاء یا عدم بقاء کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ گویا قرآن اس باب میں بالکل ساکت ہے اور اس نے اس روح سے مطلق بحث نہیں کی جو مابعد الطبیعیات سے متعلق ہے۔

سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا (پیدا کیا تم کو ایک نفس یعنی ایک نوع سے اور پھر اس سے جوڑے پیدا کئے) میرے نزدیک اس جگہ نفس واحدۃ سے مراد کوئی مخصوص ذات یا ہستی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہاں نفس سے مراد کوئی خاص ذات یا مشخص ہستی ہوتی تو اس کا استعمال مذکر صورت میں ہوتا اور اس کی صفت واحدۃ کی بجائے واحد آتی۔ وہ مفسرین جو اس سے مراد آدم وحوا لیتے ہیں، میرے نزدیک غلطی پر ہیں، کیونکہ کلام مجید نے آدم وحوا کی انجیلی روایت کی بہ حیثیت واقعہ ہونے کے کہیں تصدیق نہیں کی، بلکہ اس کو صرف استعارہ وتشبیہ کے مفہوم میں ظاہر کیا ہے۔

سورۂ الفجر میں ارشاد ہوتا ہے " یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ (اے نفس مطمئن اپنے رب کی طرف مائل ہو اس حال میں کہ تو اس سے اور وہ تجھ سے خوش ہے) اس جگہ نفس کے معنی ضمیر (CONSCIENCE) کے لئے گئے ہیں۔ نہ کہ روح کے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ سیاق وسباق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے جو میں نے بیان کیا۔ کیونکہ اس سورۃ میں بدکاروں اور نیکوکاروں کے انجام سے بحث کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ نیکی کے انجام کی مکمل ترین صورت یہی ہو سکتی ہے کہ انسان کا ضمیر مطمئن ہو کر حقیقی مسرت سے وابستہ ہو جس کو ارجعی الی ربک سے ظاہر کیا گیا ہے۔

لفظ نفس کا ضمیر کے معنے میں مستعمل ہونا سورۂ القیامہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے جہاں ولا اقسم بالنفس

اللوامہ کہکر نفس لوامہ سے ملامت ضمیر مراد لی گئی ہے۔ سورۂ الشمس میں بھی و نفس وما سوّاہا سے ضمیر انسانی مراد ہے جس کی تصدیق بعد کی آیت فالھمہا فجورھا و تقواہا سے ہوتی ہے۔

اب لفظ رُوح کے متعلق غور کیجئے۔ تو معلوم ہوگا کہ قرآن میں کسی جگہ اس سے مراد وہ روح نہیں ہے جو عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔

سورۃ الشعراء میں ارشاد ہوتا ہے:۔ وانہ لتنزیل رب العالمین۔ نزل بہ الروح الامین۔ یہاں روح الامین سے وحی و الہام مراد ہے۔

سورۃ السجدہ میں خلقت انسانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ:۔ ثم سواہ و نفخ فیہ من روحہ یہاں لفظ روح سے استعداد ترقی و ملکۂ ارتقاء مراد ہے۔ عیسیٰ کے بیان میں جہاں جہاں نفخ روح کا ذکر ہے، اس سے مقصود وہی استعداد مراد ہے جو انسان میں اخلاق بلند و تزکیۂ نفس کا باعث ہوتی ہے۔

اس امر کا ثبوت کہ کلام مجید میں لفظ روح، عام متعارف روح کے معنے میں نہیں آیا ہے سورۃ النحل اور سورۃ المومن کی ان آیات سے ہوتا ہے:۔

(۱) ینزل الملائکۃ بالروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ (یعنی ملکۂ قبول وحی و الہام ہر شخص میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ جس کو اللہ چاہتا ہے عنایت کرتا ہے)

(۲) یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ (یعنی اللہ جس کو چاہتا ہے اس میں یہ روح یا استعداد پیدا کر دیتا ہے)

اگر روح سے مراد وہی انسانی روح ہوتی تو یہ نہ کہا جاتا کہ "جس کو چاہتا ہے عنایت کرتا ہے"۔ کیونکہ وہ روح تو ہر شخص میں پائی جاتی ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ایک آیت ہے:۔ یسئلونک عن الروح۔ قل الروح من امر ربی (یعنی تجھ سے لوگ روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ سو کہہ دو کہ روح میرے خدا کے حکم سے ہے) عام طور پر سب نے یہی سمجھا ہے کہ اس آیت میں روح انسانی سے بحث کی گئی ہے اور روح کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ حالانکہ میرے نزدیک روح انسانی کا ذکر اس جگہ بھی نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہاں بھی روح سے مراد وحی و الہام ہے۔ اس کا ثبوت خود اس آیت کے سباق و سیاق سے ہوتا ہے۔

اس آیت کے بعد ہی یہ آیتیں نظر آتی ہیں۔ ولئن شئنا لنذہبن بالذی اوحینا الیک ثم لا تجد لک بہ علینا وکیلا ........... قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظہیرا۔

ان آیتوں سے یہ امر بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ رسول سے لوگوں نے روح انسانی کے متعلق نہیں دریافت کیا تھا بلکہ یہ پوچھا تھا کہ "تم جو قرآن کی بابت کہا کرتے ہو کہ روح الامین اس کو لاتا ہے، اس کو خدا نازل کرتا ہے، الہام ربانی ہے، القاء خداوندی ہے، سو اس کی حقیقت کیا ہے یعنی تم نے جو اس کا نام روح رکھا ہے سو اس کی اصلیت کیا ہے۔ اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے، اس کے حکم سے ہوتا ہے، جسکو تم نہیں سمجھ سکتے۔

ظاہر ہے کہ اگر اس آیت سے مراد روح انسانی ہوتی تو فوراً ہی اسکے بعد قرآن اور وحی کے ذکر کا کوئی موقعہ نہ تھا قرآن اور وحی کے ذکر ہی سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ یہاں روح سے مراد روح انسانی نہیں ہے۔ بلکہ قبول وحی والہام کا ملکہ مقصود ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ یہاں روح سے مراد روح انسانی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو من امر ربی کہکر کسی حقیقت کا انکشاف نہیں کیا گیا اور جسطرح دنیا کے اور تمام مظاہر و آثار کو حکم ربانی کا نتیجہ بتایا گیا ہے اسیطرح روح کے متعلق بھی کہدیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ روح کا مسئلہ جس قدر اول دن دقیق تھا، اسی قدر آج بھی ہے، اور ہمیشہ رہیگا، کیونکہ اسکی بنیاد اگر مفروضات پر نہیں تو قیاسات پر ضرور ہے اور چونکہ یہ قیاسات ہماری اسی دنیاوی زندگی کے مراحل ومنازل، تاثرات وکیفیات کو دیکھ کر قائم کئے گئے ہیں، اس لئے وہ ہمیشہ معرض بحث میں رہیں گے اور کسی پہ درجہ یقین کے حد تک اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر یقین کی کوئی صورت ہے تو صرف یہ کہ ہم مرنے کے بعد تمام کارگاہ کو اسی دنیا کی طرح تصور کریں لیکن ایسا تصور کرنیکے کیا وجوہ ہوسکتے ہیں؟ یہ بھی سوائے قیاسات کے اور کچھ نہیں ہیں۔

متقدمین ومتاخرین نے سینکڑوں کتابیں اس ایک مسئلہ روح پر تصنیف کر ڈالی ہیں، اور اگر ہم پہلے ہی سے یہ یقین کرلیں کہ اُن کے لکھنے والے یکسر حقیقت نگار ہیں، تو بیشک اس اعتقاد کی بناء پر ہم انھیں صحیح سمجھ سکتے ہیں، لیکن اگر آپ اس اعتقاد سے خالی الذہن ہوکر یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اُنھوں نے اپنے نظریات اس مسئلہ میں کیونکر قائم کئے، اُن کی علمی توجیہ کیا ہوسکتی ہے، اور ہم کیوں ان کو باور کریں، تو اس کا جواب اُن کی کتابیں کیا معنے اگر وہ خود زندہ ہوکر سامنے آجائیں، تو کوئی نہیں دے سکتے۔

بقاء روح کا خیال جیسا کہ ہم نے اپنے مضمون "مذہب کی ضرورت" میں بیان کیا ہے، بہت قدیم چیز ہے اور ابتداء آفرینش سے وہم وخیال کی صورت میں اسکا وجود چلا آتا ہے۔ کیونکہ انسان کے جذبۂ محبت کا بھی اقتضاء یہی تھا کہ جو محبوب ہستیاں اس سے جدا ہوچکی ہیں ان کی یاد قائم کرنے کے لئے کسی حقیقی تصور کو پیدا کرے اور جذبۂ خوف کا بھی یہی تقاضا تھا کہ جو متسلط یا حکمراں ہستیاں گزر چکی ہیں، ان سے ڈرتے رہنے کے لئے اُن کے اثرات کو قائم ومحفوظ سمجھے۔ اس خیال کو پیش نظر رکھکر انسان نے بقاء روح کا عقیدہ پیدا کیا اور جب مذاہب اخلاقی کی بنیاد پڑی تو مصلحین وقائدین مذاہب نے انسان کے اس قدیم خیال سے فائدہ اُٹھاکر معاد کی صورت پیدا کی جس میں نہ صرف روح انسانی بلکہ اُس کے جسم کا بھی

مبتلائے عذاب و مستحق ثواب ہونا ظاہر کیا اور چونکہ انسان صرف انھیں باتوں سے متاثر ہو سکتا ہے جنکا اسکو تجربہ ہوتا رہتا ہو اس لئے عذاب و ثواب کی صورتیں بھی وہی بیان کی گئیں جن سے ہم اس دنیائے آب و گل میں متاذی یا مسرور ہوتے ہیں۔

الغرض بقاء روح کا مسئلہ علمی دنیا کا کوئی جدید مسئلہ نہیں ہے، بلکہ دور جہل و تاریکی کا عقیدہ ہے جس سے اہل مذہب نے فائدہ اُٹھانے کے لئے مسلمات عالم اور حقائق ثابتہ میں داخل کر دیا، درآنحالیکہ اس کی بنیاد صرف وہم و خیال پر قائم ہوئی اور آج بھی کوئی علمی یا اخلاقی سبب اسکو حقیقت ثابت کرنے کیلئے پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اسی سلسلہ میں یہ گفتگو ہو سکتی ہے کہ چونکہ انبیائے کرام علم لدنی رکھتے تھے اور ان کو براہ راست اس مصدر فیض و علم سے معلومات حاصل ہوتی تھیں، جسے خدا کہتے ہیں، اس لئے ان کی تعلیمات کو صحیح نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں وہی اعتقاد کی روح کام کر رہی ہے۔ علم لدنی یا علم وحی کے معنے یہ نہیں ہیں کہ جب وہ کسی امر کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے تھے تو فوراً آنکھ بند کرتے ہی ان پر تمام حالات منکشف ہو جاتے تھے، بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ فطرت کی طرف سے وہ اچھا سوچنے والا دماغ لے کر آئے تھے اور جس حد تک درستیٔ اخلاق یا نظام تمدن کا تعلق ہے وہ اپنے وقت و زمانہ کے لحاظ سے اچھا قانون بنانے والے، اور بہتر تعلیمات پیش کرنیوالے تھے، علوم دنیا، یا حقائق اشیاء سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ ان امور سے بحث کرنا ان کے فرائض میں داخل تھا۔ اگر انھوں نے بقاء روح کے خیال کو شائع کر کے معاد کا یقین لوگوں کو دلایا تو اس لحاظ سے بالکل صحیح و درست سمجھا جائے گا کہ اس سے درستیٔ اخلاق پر اثر پڑا، لیکن جس وقت محض حقیقت کے لحاظ سے اس پر گفتگو کیجائے گی۔ تو ہم اس کے ماننے پر صرف اس لئے مجبور نہ ہونگے کہ فلاں پیغمبر یا فلاں ولی نے ایسا بیان کیا ہے بلکہ ہم یہ معلوم کرنیکے مستحق ہوں گے کہ ہم اسے کیوں ایسا سمجھیں اور اس کے صحیح سمجھنے کے لئے کیا دلائل ہو سکتے ہیں؟

جو لوگ بقاء روح کے قائل ہیں ان کی سب سے زیادہ زبردست دلیل یہ ہے کہ اگر ہم اس کے قایل نہ ہونگے تو اسکے معنے یہ ہونگے کہ خدا نے یہ سب کچھ عبث پیدا کیا۔ حالانکہ اس سے زیادہ کمزور دلیل کوئی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اسکو عبث کہنا بھی اپنے ہی اُصول حیات و معاشرت کے لحاظ سے ہے کہ جب ہم کوئی کام کرتے ہیں تو اس کے نتیجہ کے منتظر ہوتے ہیں۔ ورنہ جسوقت آپ خلاق و آفریدگار کی بے نیازیوں پر نگاہ ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ جس کا مشغلہ ہی ہر وقت بنانا بگاڑنا ہو جو ہر لمحہ ہزاروں دنیائیں پیدا کر کے فنا کرتا رہتا ہے، وہ نتیجہ، عبث، وجہ، سبب اور علت کی دنیا سے بالکل بے نیاز ہے اور اگر وہ انسان کو فنا کرنیکے بعد بالکل کالعدم کر دے اور کوئی چیز از قسم روح یا نفس اس کی یادگار باقی نہ رکھے تو اس میں کونسا استحالۂ عقلی پایا جاتا ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

وہ شخص جو بقاء روح یا قیام معاد کا قایل ہے وہ ایسے مفروضات و مباحث کا سلسلہ قائم کر دیتا ہے۔ جو کبھی ختم ہونیوالے نہیں اور ذہن انسانی کو مشوش کر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر روح قائم ہے تو اس کے قیام کی کیا صورت ہے، زمان و مکان سے اس کا تعلق ہوگا یا نہیں۔ جسم سے علیحدہ رہنے کی حالت میں اس کے تاثرات کی کیا کیفیت ہوگی؟ پھر بقاء اگر بہ معنی خلود ہے

تو اس کے یہ معنے ہیں کہ اسکو خدا کا ہمسر بنا دیا گیا۔ اگر خلود نہ ہوگا تو پھر اس بقاء کے بعد فنا کیوں اور کیسی؟ عذاب و ثواب سے کیا فائدہ جبکہ دوبارہ اس روح کو دنیائے عمل میں لوٹ کر آنا نہیں ہے، کیوں ہم ہاویہ، فردوس، پل صراط، میزان، حور و قصور، کوثر و سلسبیل، حساب کتاب وغیرہ کو صحیح باور کریں، کون سے عقلی دلائل اُنکے وجود میں پیش کئے جا سکتے ہیں، اگر ان سے انکار کیا جائے تو خدا کا کیا نقصان ہوتا ہے، اُس پر کیا الزام آتا ہے۔ الغرض اسیطرح کے ہزاروں مسائل و مباحث ایسے پیدا ہو جاتے ہیں، نہ جنکو آجتک حل کیا گیا اور نہ آیندہ ممکن ہے۔ لیکن دوسرا شخص جو بقاء روح کا قائل نہیں اور مرنیکے بعد نسیاً منسیاً کا ماننے والا ہے، وہ ان تمام مباحث کے دروازہ کو بند کر دیتا ہے اور کوئی اعتراض اسکے اس عقیدہ پر عقل کی طرف سے وارد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جہانتک قدرت خداوندی کا تعلق ہے، اس صورت میں اسکا ظہور زیادہ روشن ہو جاتا ہے اور کائنات کی وسعت، عالم تخلیق کی بے پایانی کو دیکھتے ہوئے یہی عقیدہ زیادہ قرین عقل و انصاف معلوم ہوتا ہے، کیونکہ خلق و فنا کا سلسلہ اسیطرح ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جن مخلوقات کو وہ فنا کر دے، انکے کسی اثر یا کسی جزو یا کسی کیفیت و تاثر کو باقی رکھے۔ اس کا کام یہی ہے کہ جسکو مٹا دیتا ہے، بالکل محو کر دیتا ہے، اور اسے کوئی غرض نہیں کہ اس کا سلسلہ پھر کسی صورت سے قائم رکھے۔

یہ ہیں دونوں صورتیں بقاء روح اور عدم بقاء روح کے ماننے کی۔ اسلئے ایک مجھ سے کیا دریافت کرتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے اگر آپ بقاء روح کے خیال کو ضروری سمجھتے ہیں اور آپ کا اطمینان نفس اسی طرح ہوتا ہے تو مانئے اور اگر نہیں ہوتا تو بیشک انکار کر دیجئے کیونکہ عذاب و ثواب جس چیز کا نام ہے اسکو ہم بغیر بقاء روح تسلیم کئے ہوئے بھی اس دنیا میں متعین کر سکتے ہیں جو زیادہ قریب الفہم اور کارآمد بات ہے۔

اس سلسلہ میں یوروپ کے موجودہ روحانئین اور انکی تحقیقات کا ذکر فضول ہے، کیونکہ اس وقت تک کوئی ثبوت انکی طرف سے بقاء روح کا پیش نہیں کیا گیا اور جو واقعات و حالات بیان کئے جاتے ہیں اول تو ان میں اکثر مکر و فریب ہے اور بعض ایسے ہیں جو نتیجہ ہیں خود اپنے فکر و اعتقاد کا، اور حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔

---

# اس کو بھی پڑھ لیجئے

(۱) جن حضرات کا چندہ ختم ہو رہا ہے انکو ایک مطبوعہ تحریر سرخ کاغذ پر اس رسالہ کے اندر ملیگی اس لئے مناسب یہی ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ ۳۰ جنوری تک اپنا سالانہ چندہ روانہ کر دیں ورنہ ۴ جنوری سے وی پی کی روانگی شروع ہو جائے گی۔ ایک مطبوعہ کارڈ بھی اس کے ساتھ ہی ملیگا۔ جس سے مقصود یہ ہے کہ آپ اپنے حلقۂ احباب سے کم از کم دو جدید خریدار پیدا کر کے نگار کی توسیع اشاعت میں حصہ لیں۔

(۲) نگار کے ہر خریدار کو اس کا چندہ نئے سال کا وصول ہونے پر حسب ذیل کتابیں نصف قیمت پر ملیں گی۔

تذکرۂ خندۂ گل بجائے للعہ کے دو روپیہ میں۔ شاعر کا انجام بجائے ۱؍ کے ۵؍ میں۔ نگارستان جدید اڈیشن بجائے ۶؍ کے ۳؍ میں۔ شہاب کی سرگزشت جدید اڈیشن بجائے (عہ) کے ۱۲؍ میں۔ جن کے گذشتہ پرچے بجائے ہر فی پرچہ کے ۲؍ میں۔ اور سائنس کے عجائب مفت جو صاحب یہ تمام کتابیں طلب کرینگے ان سے محصولڈاک بھی نہ لیا جائے گا۔

"منیجر نگار"

# "شاعر"

خاک پر کھینچا گیا نقش طلسم رنگ و بو، بند تھا سینے کی خلوت میں جمالِ آرزو
کیف کے نغموں سے تھا محروم سازِ گفتگو بزم کو تھی، اک دلِ رمز آشنا کی جستجو،
حسن نے اسرار کے پردوں کو جنبش دی نہ تھی،
جلوۂ خوابیدۂ ہستی نے کروٹ لی نہ تھی،

پھول کے اوراق تھے ناآشنائے آبِ رنگ خندۂ اصنام سے تھی بیخبر ترکیبِ سنگ
رہن ترکش تھے جگر میں ڈوبنے والے خدنگ گم دلوں کی وسعتِ خاموش میں تھی ہر اُمنگ
اُنگلیاں مطرب کی پیہم دوڑتی تھیں ساز پر
کچھ مگر خود رفتگی سی تھی نوائے راز پر

دہر میں انوار کی ایسی گھٹا چھائی نہ تھی، محفلِ ہنگامۂ اسرار تنہائی نہ تھی،
مسکراتی صبح میں یہ "بادہ پیمائی" نہ تھی شام کی اس درجہ کیف انگیز انگڑائی نہ تھی،
روح کی خلوت میں دخل بیخودی ہوتا نہ تھا
سینۂ بربط میں نغموں کا لہو دوڑا نہ تھا

ناگہاں! امواجِ ناپیدا میں اک جنبش ہوئی کان میں فطرت کے نغموں کی صدا آنے لگی
مسکرا کر رازِ دل کہنے لگی نورس کلی، پھول نے چھیڑی نشاط انگیز میٹھی راگنی
برق گزری خرمنِ غفلت سے لہراتی ہوئی
روح کو بیداریوں کا راز سمجھاتی ہوئی

خود بخود، اُٹھنے لگا، روئے حقیقت سے نقاب ہو گئے خلوت سرائے حسن کے باطل، حجاب
چھڑ گئے، ہر سمت اٹھلاتی ہواؤں کے رباب دل میں گھر کرنے لگا، سلمائے گیتی کا شباب
جلوۂ نو سے ہوئی ترتیبِ رنگِ صبح و شام
کر دیا آخر ادا، شاعر نے فطرت کا پیام

کون شاعر! جس نے پہچانا، طلسمِ ہست بود — کون شاعر! جس کے منت کش ہیں اسباب نمود
کون شاعر! جسنے کھولے عقدۂ رازِ وجود — کون شاعر! شمع بزم جلوہ آرائے شہود

جس کی ہستی دستبُردِ موت سے آزاد ہے
جس کی دُنیا سرمدی انوار میں آباد ہے

جس کے ہر ذرّے میں ہے خورشیدِ عرفاں کی جھلک — جسکی ارضِ محترم تک جھک کے ملتا ہے فلک
دردِ عالم کا مداوا، جس کے سینے کی کھٹک — انجمن افروز، جس کے شعلۂ غم کی لپک

قصرِ باطن کو تجلی زار کرنے کے لئے
داغِ دل، شاعر کے بڑھتے ہیں اوبھرنے کے لئے

جس کی محفل ہے، طرب گاہِ عروسِ نو بہار — جسکی خاکِ آستاں ہے صد گلستاں در کنار
فکرِ شاعر، اُس فضائے نور میں ہے گرمِ کار — گنگناتے ہیں، جہاں خورشید و مہ کے آبشار

صبح، اُس کی روح کی، اک جنبشِ بیدار ہے
شام، اُس کے ساز کا، اک نغمۂ سرشار ہے

اے کہ تو ہے عظمتِ شاعر سے منکر، بے خبر — دیکھ کچھ کہتی ہے تیری ہستیٔ نا معتبر
سطح کے جلووں میں ہے اُلجھی ہوئی تیری نظر — طبعِ شاعر مطمئن ہوتی ہے تہ میں ڈوب کر

روح کی آواز ہے، بیدار کُن الہام ہے!
شعر کیا ہے؟ فطرتِ آزاد کا پیغام ہے!

فکرِ شاعر گلشنِ فطرت سے جب چنتی ہے پھول — پھوٹتا ہے جن سے پیہم جلوۂ حُسنِ قبول
بیخبر اُٹھتے ہیں، انکی بو سے اوہامِ فضول — ان سے بنتے ہیں، ترے علمی ترانوں کے اُصول

نغمۂ شاعر، کہ شبنم ہے گلستاں کے لئے،
اک چراغِ علم و عرفاں ہے دلستاں کے لئے،

پستیوں میں تیری منزل اور بلند اُسکا مقام — ذرّۂ ناچیز تو، وہ مہر و مہ سے ہمکلام
تلخ تیری گفتگو، اور دلنشیں اُس کا پیام — تو سراپا حُزن، وہ غمگینوں میں شاد کام

بابِ فطرت اُس پہ وا، نا آشنا تیری نظر
تو گرفتارِ فریب اُس کو حقیقت کی خبر

شوخ! کیا تو بھی سمجھتا ہے، مزاجِ رنگ و بو، — تجھ سے بھی غنچے رہا کرتے ہیں محوِ گفتگو

ذرّہ ذرّہ ہے ترا، آئینہ دارِ جستجو، بزمِ فطرت میں ہے روشن تیری شمعِ آرزو

تیرے سینے میں بھی دل ہے، اک ہجومِ اضطراب
لذتِ غم، تجھکو بھی رکھتی ہے کیا محرومِ خواب

تو بھی چمکاتا ہے، روحوں میں محبت کے شرار بیکسی کے دل میں چونکاتا ہے طوفانِ وقار،
کر سکا ہے، تو بھی خوابیدہ حسوں کو ہوشیار اک گھڑی شاعر کی، ناداں! تیری عمرِ بیشمار،

موت کی وادی میں ہے آباد تیری کائنات
سُن! کہ شاعر تجھکو سمجھاتا ہے اسرارِ حیات،

آفتاب اُبھرا ہے، جامِ صبح چھلکائے ہوئے روئے گردوں پر، مگر بادل بھی ہیں چھائے ہوئے
شعر کیا ہیں، کچھ حسیں جلوے ہیں شرمائے ہوئے چند نغمے، دل سے لب تک ٹوٹ کر آئے ہوئے

تجھکو کیا معلوم، ان کی تہ میں کیا اسرار ہیں
سینۂ شاعر میں کتنے جلوہ بیدار ہیں

شمع جب خاموش عہدِ حال کی ہو جائے گی، نسلِ آئندہ نئی تہذیب لیکر آئے گی،
عقدۂ گیسوئے دوراں، بزمِ نو سُلجھائے گی، "قصۂ پیشیں" ہماری داستاں کہلائے گی،

قصرِ عہدِ حال، آنسو کی طرح بہ جائے گا،
بارگاہِ عصر، شاعر کا چمن رہ جائے گا،

تجھکو ہے، جس مشعلِ حکمت پہ ناداں یہ غرور ہے وہی بجھتی ہوئی، اک شمعِ شاعر کے حضور
تیری ہر جنبش میں ہے، بیدار امکانِ قصور شعر ہے، لیکن تجلّی گاہِ تکمیلِ شعور

تو جہاں اس وقت تک محوِ حجابِ راز ہے،
شاعر اُس طورِ حقیقت پر لوا پرداز ہے

جب ازل میں کیگئی، تقسیمِ انعام و عطا، مسکرائے پھول، عطر افشاں ہوئی موجِ صبا
شب نے سر پر ڈال لی، رنگین تاروں کی ردا صُبح نے بڑھکر حریمِ حُسن کو وا کر دیا،

بزم کو سونپا گیا، پیکِ فنا کو اہتمام
فرقِ شاعر پہ، مگر رکھا گیا، تاجِ دوام

علی اختر

# "طرۂ گل"

حسنِ برق افگن، پھر اُس میں جلوۂ "شانِ نمو"
نازِ کامل کیلئے "مہرِ شہادت" بے گماں،
ابروؤں کی جنبشیں "وجہ نشاطِ آرزو"
زلف کے حلقوں میں "استغنا" کی جلوہ ریزیاں
اُسکی آرائش سے پیدا "فطرتِ آسودگی"
اُس کی لہروں میں "تموج" عالمِ انوار کا
"چھیڑ" اس کی باعثِ تنظیمِ اجزائے چمن
میفروشیِ مژہ "پیغام" کیفِ مستقل
حبِ اُٹھائے چشمِ کافر "سے پلک اپنی نقاب
اُن کی "مے پاشی" میں پنہاں نازشِ ہر نازنیں
انکی خندہ ریزیاں، "صبحِ نیاز" عاشقی
پھول سے عارض دمِ زینت "جوابِ گلکدہ"
دید کی ہر آرزو پر رونما "صدہا حجاب"
بجلیوں کا ایک طوفاں خندۂ لب سے عیاں
نغمہ ہائے دلنشیں صوتِ تکلّم پر فدا
فرطِ خاموشی پہ "وارفتہ" تماشائے نظر
اسقدر دل کش لطافت گردنِ بلور کی
یعنی اک خورشید طلعت بلکہ رشکِ آفتاب
بوستاں کی سیر سے واپس جو آئی نازنیں

"انعکاسِ صبح" سے ظاہر خیابانِ نمو،
"گل کدوں کی رُوح" تھی فرقِ مسرت پر عیاں،
اور خاموشی لبِ غیرت دہ "صد گفتگو"
سر بسر پیچ و خم میں "اہتزاز انگیزیاں"
اُسکی "بیرنگی" سے جیرِ خلقتِ آسودگی
اُسکی "لغزش" میں تماشا نشۂ میخوار کا
"لرزشِ انداز"، اس کی لرزشِ بادِ ختن
"رقصِ ہستیِ نظر جس سے لطمے بھی خجل
سامنے آئیں وہ "ساغر" جن میں ہو کُنہ شراب
اور اُنکی برہمی، "بیداریِ" حسنِ حزیں
اُنکی حسرت خیزیاں "شامِ گدازِ عاشقی
یا کنول کی پنکھڑی جیسمیں "شبابِ ملکدہ"
"چشمِ وارفتہ"، اسیرِ حلقۂ صد پیچ و تاب
لطفِ حسنِ لیستگی رنگِ بہارِ بے خزاں
ہلکا ہلکا سا تبسم، "داستانِ جاں دلربا
نازِ روپوشی، بہارِ عیشِ ماموِرِ اثر
لوٹ جسکی تمکنت پر، برق، کوہِ طور کی
جسمیں وہ رعنائیاں، جن سے "عبارت ہے" شباب
"غسلِ شبنم" دیکھے لائی چند گلہائے حسیں

اور اِن کے گوندھنے میں یوں ہوئی پھر نغمہ زن :-

"حجلۂ فطرت کہوں یا تم کو گلہائے چمن"
"شب کو "ارواحِ معطر" کے لئے آرامگاہ"
"صبح کو نکہت فشاں کیا کیا برائے انتباہ"
"تازگیٔ گُل میں پنہاں فطرتی وہ دام ہے"
"جسنے کی اس پر توجہ، وہ اسیرِ و رام ہے"
"پھول جو مرجھا گئے، تو ہار بھی مرجھائے گا"
"وہ" نہ پائیں گے اسے تازہ تو دل کملائے گا"
"مجھ سے وہ روٹھیں مرے اللہ، تیری شان ہے"
"یا غرورِ عشق کی یہ انتہائی آن ہے"
"خیر سے سہنے پڑے ہیں عشق میں ظلم و ستم"
"ہر نفس کی کیفیت کرتی ہے مجھ کو تازہ دم"
"وہ "خفا مجھ سے اگر ہیں تو مجھے پروا نہیں"
"کیا مرے پھولوں میں پنہاں "سحر کی دنیا" نہیں"
"کیوں ہو چپ پھولو؟ بتاؤ مجھ پہ کب ہوگا کرم؟"
"کعبۂ دل میں مرے آئیگا کب میرا صنم"
"اشکِ حسرت میری آنکھوں سے اگر بہ جائیگا"
"ناتکمل "یہ طلسمِ آرزو" رہ جائے گا"!!

"روحِ گُل" بولی یہ سُن کر اے بہارِ بیخزاں!

"تیری فطرت پہ فدا میں اور سارا گلستاں"
"ایک "سیلابِ ترنم" گو مرا مسکن سہی
"ایک طوفانِ تبسم" گو مرا مامن سہی
"گلشنِ رنگ و تعطر گو مرا کاشانہ ہے"
"ماہِ تاباں کی کرن، میرا "چراغ خانہ" ہے"
"میں "نسائیت" پہ تیرے ہوں فدائے نازنیں"
""درد" بن جاؤں سراپا، تو جو ہو جائے حزیں

"دشمنوں کو تیرے اتنا سوگ ہو اے مہ لقا"
"تو نہ اتنا رنج کر تجھپر مرا دل ہو فدا"
"ہے اگر تاثیر کچھ بھی "سحرِ گل" میں مغتنم"
"طرۂ گل" دیکھتے ہی لیں گے وہ تیرے قدم"

"سُن کے یہ سارے بدن پر اک "نمی سی آگئی		اک "شباب، آسودہ" رنگینی نگہ میں چھا گئی"
"کامیابی تمنا کے مزے آنے لگے		خندہ زا آنکھوں سے اُسکی پھول شرمانے لگے"
گو بظاہر ہو گئی خاموش سی وہ فتنہ گر		"ترجمانِ قلب" لیکن یوں ہوئی اُس کی نظر"

"ابتدا میں" ان کی "جب مجھپر پڑی چشم کرم"
"اور "اُن کی" گفتگو نے جان ڈالی دمبدم"
"ہر نظر تھی، کیف ساماں، ہر ادا مستانہ تھی"
"وائے معصومی مری، ہر شے سے میں بیگانہ تھی"
"دل نے کی فوراً پذیرائی مگر اس شوق سے"
"ابتدا ہی" سے تھا واقف جیسے وہ اس ذوق سے"
"مجھکو یہ تسلیم ہے اُلفت نہیں ہے اور کی"
"عادتیں کیوں آگئیں پھر اُن میں ظلم و جور کی"
"کون کہتا ہے مری حسرت نکلنی چاہیئے"
"جس میں راحت ہو "اُنھیں" وہ راہ چلنی چاہیئے"
"ہے نشاطِ دل کا باعث "تشنہ آغوشی مری"
"سلسبیلِ گوش" ہے، ہر طرز خاموشی مری"
"مجھکو آسائش ہے اسمیں جسمیں راحت ہو اُنھیں"
"اور "اُس سے ہو محبت جس سے ہو الفت اُنھیں"
"ہر ادا میرے لئے "اُنکی "جہانِ عشق ہے!"
"شیوۂ اُلفت میں پنہاں، میری جانِ عشق ہے!"

سنتے ہی یہ نغمہ سوز و گداز آرزو		ہو گئیں حافظ فضائیں دلنواز آرزو!

حافظ غازیپوری

# ہارون رشید کی مجلسِ داستاں سرائی

نیرنگ (رامپور) کی کسی گذشتہ اشاعت میں عنوان مذکور کے تحت ایک تصویر شائع ہوئی تھی۔ میں نے اُس پر یہ فسانہ نظم کیا تھا، جو مقررہ وقت تک مکمل نہ ہونیکے باعث شائع نہیں کیا جاسکا۔

فسانہ فرضی ہے اور جدت سے کوسوں دور۔ اس میں بھی وہی رونا رویا گیا ہے، جس کو مصلحین کی زبان اور آنکھیں بارہا دُہرا چکی ہیں۔ اسی لئے بے مزہ ہونا غیر یقینی نہیں۔ لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے، اس میں گریہ و بکا کا پہلو اس قدر روشن نہیں ہے کہ سامع پر یاس و نا امیدی کا پورا تسلط ہوجائے۔

تمہید کی دلکشی میں جمالیاتی نقوش کے ابھار سے مدد لی ہے، آغازِ داستان میں اس کا لحاظ رکھا ہے کہ یکایک قصہ کے متعلقات کا سراغ نہ لگنے پائے، اس طرح ابہام اور کنایہ قصہ کو بامزہ رکھنے کے کفیل ہوجاتے ہیں، جس سرزمین سے یہ داستان متعلق ہے، اس کی جغرافیاتی اور معاشرتی تشکیل کے بعد، ایک "انسان کامل" کے ظہور کا بیان ہے، جس نے اپنی "مثالی اخلاقی تعلیم" سے دنیا کے ہزارہا سالہ نظامِ حکومت و معاشرت کو یکسر بدل دیا تھا۔ چونکہ سامع کے واسطے اسی حصہ میں سامانِ رشد و ہدایت پنہاں ہے، اس لئے حدیثِ شوق کی طرح اس کو بھی بیحد طویل کردیا ہے، خاتمہ نہایت سادہ مختصر اور پر معنے الفاظ پر ہوا ہے، جس میں خاص طور پر اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ شاعرانہ زبان میں تاریخی حقیقت و مسلمہ کو بیان کیا جائے۔

اُردو میں اس قسم کی تمثیلی نظمیں بہت کم ہیں۔ ممکن ہے میں بعض ضروری نقوش کو چھوڑ کر، غیر ضروری کی طرف متوجہ ہوگیا ہوں، اور اس لئے نظم کے تمثیلی پہلو میں نقص رہ گیا ہو، لیکن چونکہ یہ میری پہلی کوشش ہے، اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ نقادانِ فن کی صحیح تنقید کے بعد اس سے بہتر نقش پیش کرسکوں گا۔

امتیاز علی عرشی

(۱)

تھے امیر المومنیں ہاروں پریشاں ایک شب — کارہائے سلطنت نے کردیا تھا خستہ جاں،
خوابگاہِ خاص پر چھایا تھا پرہیبت سکوں — لرزہ براندام استادہ تھیں رومی باندیاں،

بہرِ تسکینِ دماغ و دل، ہوا فرمانِ شاہ، آئیں خلوت گاہ میں داستاں سرا کچھ لونڈیاں"
حکمِ شاہی یوں بجالائے غلامانِ حرم بس اُسی دم دو کنیزیں آگئیں لبستہ میاں

(۲)

روحِ حسن و جانِ خوبی، کانِ تمکین و حیا جن کے ہر ایما پہ قرباں شانِ صد طغرل طغاں
شوخیاں جن کی نگاہوں سے ٹپکتیں برملا، جن کی مستانہ نگاہوں سے برستیں مستیاں،
دلِ لبھائے عشق گھائل جن کے تیر عشق سے دین و دل کو لوٹنے والی تھیں جن کی شوخیاں،
قندِ مصری باہمہ شیرینی ہونٹوں پہ نثار گفتگو پر، باہمہ موسیقی قرباں طوطیاں،

(۳)

پا کے ایما ایک فتنہ در جبلو نے عرض کی "آپ بیتی ہو، کہ جگ بیتی ہو میری داستاں؟"
شاہِ ایران و عرب مستِ مے پندار تھا بول اُٹھا" بس آپ بیتی۔ آپ بیتی، آپ۔ ہاں!"

(۴)

تھا کسی اقلیم میں اک خطہ بے آب و گیاہ وسعتِ صحرا میں جسکی کچھ نہ تھا جز آسماں
ریگِ جوشندہ کا جاری بحرِ ناپیدا کنار آتشِ خورشید سے بھنتی تھیں جسمیں ہرنیاں
نغمۂ راحت نہ گونجا تھا فضاؤں میں کبھی، شکلِ سبزہ تک نہ دیکھی تھی پہاڑوں نے وہاں
اطعمہ[۲] میں شیر و خرما، البسہ میں شعر و صوف، مشغلہ ولعب جانا خلق [illegible] بحر یا ل،
سرکشی و جہل سے تکوینِ ذراتِ جبال ابلہی و جو سے تخمیر سرِ پیر و جواں،
جو بعید از عقل وہ اون کے عقائد کے قریب جو قریب از فہم وہ اُن کے تخیل سے نہاں
ایک مدت تک یہی حالت رہی، پر تا کجا؟ حق کی راہیں کھل گئیں اک مردِ حق پر ناگہاں
قوم نے دیکھا تو پہلے کچھ جھجک کر رہ گئی، پر صداقت کی کشش نے کھینچ لی آخر عناں
تھا حدی آسمانی سے رسیلا بحر و بر چل پڑا حقانیت کے راستہ پر کارواں
راہ میں جو کچھ ہوا حائل، کیا اوس کو عبور، لوگ کہتے ہیں کہ اوس کا راستہ ہے کہکشاں
ایک عالم کر لیا زیرِ نگیں اخلاق سے، ایک دنیا ہو گئی تسخیر بے تیغ و سناں
حق و عرفاں کا سمندر آسماں تک چڑھ گیا مادرِ فطرت نے دیدالیں انھیں سب خوبیاں

---

[۱] نقادانِ فن اس ترکیب کی غلطی کو معاف فرمائیں۔ عرشی
[۲] اطعمہ جمع طعام۔ البسہ جمع لباس۔

جان کی پاؤں اماں، تو اتنی میری عرض ہے — جانشینوں نے بھلا دی اُنکی ساری داستاں
شہر کی راہوں پر ہوئے، بیباک نبگر، گامزن — رہ گئیں منہ دیکھتی کی دیکھتی سب نیکیاں
کاٹ پھینکا خون سے سینچے ہوئے اشجار کو — اب نہیں کچھ یاد اُن کو راہ و رسمِ باغباں

(۵)

شاہ از خود رفتہ سا لیٹا ہوا تھا تخت پر — چونک کر بولا "مرا معذور داں، سروِ جہاں"
چشمۂ اندر حدودِ خود بود آبِ حیات
چوں قدم بیرون نہد، برباد سازد یک جہاں

امتیاز علی عرشی

---

# غزل

فرقِ پروانوں میں اور ہم میں نمایاں ہونگے — وہ جلیں آگ میں ہم آپ پہ قرباں ہونگے
وہ اگر اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہوں گے — حشر میں میرے لئے حشر کے ساماں ہونگے
ایک طوفانِ تغیر ہیں خیالاتِ وفا — یہی ارمان بنینگے یہی حرماں ہوں گے
کثرتِ جرم ہے آئینۂ حیرت افزا — توبہ کرلیں گے تو بیکار پشیماں ہوں گے
موت ہر حال میں یکساں ہے وہ تم ہو کہ اجل — صرف اتنا ہے کہ شرمندۂ احساں ہونگے
تم سلامت رہو وعدوں کو بھلانیوالے — سینکڑوں مرتبہ یہ عہد یہ پیماں ہونگے
آج پیتے ہیں گھٹا آئی ہے گھر کر زاہد — کل کسی وقت کھلے گا تو مسلماں ہونگے
فصلِ گل ساتھ لئے آئیگی وحشت کی ہوا — ہم جہاں ہونگے وہاں چاک گریباں ہونگے
پائے بت پر نظر آتی ہے جبینِ اقدس
ہمکو دھوکا تھا کہ شوکت بھی مسلماں ہونگے

(شوکت تھانوی)

# صدرِ بزم

وقت بیتابی ہے بحرِ بیکرانِ زندگی    اضطرابِ جاوداں ہی سے ہے شانِ زندگی
زندگی ہے شعلۂ جاوید طورِ کائنات    آفتابِ زندگی سے ہے ظہورِ کائنات
گو معمہ ہیں سراپا ممکناتِ زندگی    شاخِ آہو پر نہیں لیکن براتِ زندگی
برق پارہوار ہے جس کو غمِ منزل نہیں    سیلِ بے پروا ہے جو شرمندۂ ساحل نہیں

ابتدا ہے زندگی یا انتہا ہے زندگی
کاش اتنا ہی کہیں کھل جائے کیا ہے زندگی؟

زندگی جب روشناسِ قالبِ انساں ہوئی    نور کے سانچے میں ڈھل کر دیدۂ حیراں ہوئی
دیدۂ حیران نے قلبِ مضطرب پیدا کیا    اضطرابِ قلب نے ہنگامہ وہ برپا کیا،
جس کو عرفِ عام میں کہتے ہیں ذوقِ جستجو    جس کی تھی مہر و مہ و انجم تلک کو آرزو،
حسن کی ہنگامہ آرائی نے چمکایا اسے    عشق کے سوزِ جنوں ساماں نے گرمایا اسے

زندگی انساں میں آکر ہو گئی عالی صفات
ناتواں جانِ بشر اور صدرِ بزمِ کائنات

مسندِ تقویمِ احسن کیا ملی؟ غم مل گیا!    آگہی کیا آگئی؟ عہدِ سکونِ دل گیا؟
آسمان جانِ حزیں کا دشمنِ دیرینہ ہے    یہ تو یہ اہلِ فلک تک کے دلوں میں کینہ ہے!
چین لینے دے زمانہ یہ کبھی ممکن نہیں    چھوڑ دو [illegible] ستانا یہ کبھی ممکن نہیں
شاہبازانِ حوادث بھی ہیں پر تولے ہوئے    موت ہر ہر گام پر بیٹھی ہے موُنھ کھولے ہوئے

دیدہ و نادیدہ دشمن درپئے آزار ہیں
ایک جانِ ناتواں سے برسرِ پیکار ہیں

ابنِ آدم! ماسوا کو رام کرنا ہے تجھے    تو ہے مسجودِ ملائک نام کرنا ہے تجھے،
جاوداں جوہر ترا آنی نہیں فانی نہیں    تو نے اپنی قدر اب تک آپ پہچانی نہیں،
ہفتخوانِ این و آں ہیں آزمائش کے لئے    قوتِ بازوئے آدم کی نمائش کے لئے،
یہ تری "میں" ہی سراپا کن فکاں کا راز ہے    نازِ زیبا ہے جسے اُس حسن کا تو ناز ہے،

جس کا بجھ جانا مقدر ہو تو وہ اخگر نہیں
ٹوٹ جانے کا جسے ڈر ہو تو وہ گوہر نہیں

امین حزیں

# تخیلاتِ عدم

"کمالِ درد ملا، درد آشنا نہ ملا!" ستم ظریفیٔ فطرت کا مدعا نہ ملا!
جنوں سوار تھا سر پہ کہ پاؤں توڑ آئے کچھ اپنی منزلِ موہوم کا پتہ نہ ملا!
حریصِ ظلم ہوئے جب اسیرِ لذتِ غم فلک کو اور کوئی شیوۂ جفا نہ ملا!

---

طغیانیٔ غم دل میں اور ضبطِ فغاں، توبہ! خاموش زباں سے کیا شعلہ نہ اٹھا ہوگا
او سنگدلو! جاؤ خنجر بھی اٹھا لاؤ چبھتی ہوئی باتوں سے دل تو نہ بھرا ہوگا

---

بندۂ تدبیر ہوں، راحت کہاں میرے لئے دہر ہے اک خارزارِ امتحاں میرے لئے،
کونسی راحت پہ ہو آبِ بقا کی آرزو موت ہو جائیگی عمرِ جاوداں میرے لئے،

عدمؔ

---

## مذاہب الاسلام

عجیب غریب کتاب ہے گویا ایک دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ یعنی اسلام میں جتنے مذہب اور جتنے فرقے اور جس فرقے کے جو عقیدے اور رسمیں ہیں جس فرقے کا جو بانی ہوا ہے وہ سب اس میں نہایت واضح طور پر درج کئے ہیں۔ ممکن ہی نہیں کہ کوئی ایک صفحہ پڑھ کر بغیر ختم کئے کتاب کو چھوڑ دے قیمت (للعہ)

**دیوانِ خواجہ میر درد** خواجہ میر درد کا درد و اثر بھرا کلام نہایت خوشخط معہ اعلےٰ رنگین خوشنما ٹائیٹل کے اس میں ایک مقدمہ مولانا عبدالباری آسی کا شامل ہے جو حقیقتاً ایک لطیف اضافہ ہے۔ اور اس میں خواجہ صاحب کے شاگردوں کے حالات و کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ار

**دیوانِ خواجہ آتش** اس مرتبہ اس دیوان کو نہایت عمدہ کاغذ پر بعد صحت و صفائی کے بعد چھاپا گیا ہے۔ قیمت عہ
دیوان ذوق ۱۲ار دیوان غالب معہ اضافہ کلام جدید عہ کلیات ناسخ بطرز جدید عہ

منیجر نولکشور پریس صیغہ بکڈپو، لکھنؤ،

(بہ سلسلہ صفحہ ۸) لیکن ابھی دور نہیں آئی لفظہ ہیجان و اشتداد میں، جبکہ مسلم افراد بھی ہندوؤں کے دوش بدوش جیل میں جا رہے تھے یکساں صبر و تحمل کے ساتھ حکومت کی سختی کو برداشت کر رہے تھے، یہیں لکھنؤ سے جہاں ہر ہندو اُردو لکھنے پڑھنے کا عادی ہے، کانگریس کے دفتر سے جو لٹریچر شائع ہوتا ہے، جو اطلاعات آویزاں کیجاتی ہیں، ان میں غالب حصہ ہندی کا ہوتا ہے اور جو بیج تیار کئے جاتے ہیں، ان میں ایک لفظ بھی اُردو کا نہیں ہوتا، اور ہندی میں بھی جو عبارت درج ہوتی ہے وہ یکسر ثقیل سنسکرت ہوتی ہے۔ کیا اس سے زیادہ ناعاقبت اندیشانہ عصبیت کوئی اور ہو سکتی ہے، کیا اس سے زیادہ ناموزوں و نامناسب محل اس جذبۂ نفرت کے اظہار کے لئے کوئی اور ہو سکتا تھا۔ پھر یہ منظر صرف لکھنؤ اور دفتر کانگرس کی فضا میں محدود نہیں رہتا، بلکہ زبان کے مسئلہ میں گاندھی آشرم اور آنند بھون کے اندر بھی وہی ایک آواز گونجتی ہوئی نظر آئیگی۔ اور الہ آباد یونیورسٹی سے لیکر ڈسٹرکٹ بورڈ کے اُس ابتدائی اسکول تک جہاں ایک صاحب اقتدار ہندو بھی سانس لے رہا ہے، یہی کوشش کام کرتی ہوئی دیکھی جائے گی کہ اُردو تعلیم، اُردو رسم الخط، اُردو تصانیف سب کو صفحۂ ہستی سے محو کر دیا جائے، ڈاک خانے جائیے تو وہاں کا ہندو کلرک منی آرڈر فارم ہندی زبان ہی کا دیگا اور اگر اُردو فارم کی خواہش کیجائے گی تو اس کا جواب یہی دیا جائے گا کہ اردو فارم نہیں ہیں، حالانکہ ایک غیر تقسیم شدہ انبار اُردو فارم کا دیمک کی نذر ہو رہا ہے۔ عدالتوں میں جائیے، دفاتر کی سیر کیجئے، دکانوں سے معاملہ کیجئے، الغرض ہر جگہ اور زندگی کے ہر شعبہ میں جہاں کہیں کوئی ہندو کی ذات کام کر رہی ہے، اُردو کے ساتھ بغض و عناد کا جذبہ یکساں طور پر کام کر رہا ہے، اور ایک عام نفرت ہندوؤں میں اس کی طرف سے پیدا ہو گئی ہے؟

اس لئے اگر ارباب اکاڈمی، جن میں غالب حصہ ہندوؤں کا ہے، اردو کا حق تلف کرنے میں جسارت سے کام لے رہے ہیں، اگر وہ اردو کے تراجم کام بھی ہندوؤں سے لینا چاہتے ہیں اس خیال سے کہ وہ زیادہ بہتر طریق پر اردو کو برباد کر سکیں گے، اگر ہندوؤں کی اشاعت گاہوں سے اُردو کی ریڈریں مسخ شدہ صورت میں نکل رہی ہیں تو جائے حیرت نہیں کیونکہ یہ سب اسی ایک مقصد کے تکمیل کی مختلف تدابیر ہیں، جس کے ذریعہ سے پھر ہندوستان کے اس دور کو از سر نو پیدا کیا جانیوالا ہے۔ جسے عہد آخر میں مرہٹوں نے زندہ کرنا چاہا تھا، لیکن بدقسمتی سے "دولت مستعجل" ثابت ہوا۔

کس قدر عجیب و غریب جسارت ہے، کتنی حیرتناک جرأت ہے کہ ہندوستان کی ایک عام مشترک زبان بنانے کے بہانہ سے اُردو میں تو ہندی و سنسکرت الفاظ داخل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جائے۔ ایک اردو رسالہ پر بجائے سہ ماہی کے تماہی لکھنے کے لئے اکاڈیمی اپنی پوری قوت صرف کر دے، لیکن جس وقت ہندی لٹریچر کا سوال سامنے ہو تو تماہی کے بجائے "ترٹی ماسی پترکا" ہی کا اختیار کرنا ناگزیر ہو، اور الہ آباد یونیورسٹی کا وائس چانسلر جب کوئی پریس لکھے، تو اکاڈیمی اس کو ایک نعمت و برکت سمجھ کر بغیر کسی تنقید و اعتراض کے شائع کرنے پر آمادہ ہو جائے، خواہ اسکے ثقیل و نامانوس الفاظ خود ہندو جماعت ہی کے لئے ناقابل فہم معمہ کیوں نہ ہوں؟

یہ کیا تماشہ ہے، یہ کس قسم کی ابلہ فریبی ہے، یہ کس نوع کی کورانہ ذہنیت ہے۔ اگر ہندوؤں کی عام جماعت اس کو نہیں سمجھ سکتی تو خواص کے پاس اس کا کیا جواب ہے، اور خواص کو بھی جانے دیجئے، کم از کم اکاڈمی کے ممبران کو تو غور کرنا چاہئیے کہ حکومت سے جو رقم اُردو کی ترقی کے لئے ملتی ہے، اس کے صرف صحیح میں بخل و عصبیت سے کام لینے کا انھیں کیا حق حاصل ہے؟

آخر یہ کیسی دستبرد ہے، یہ کس طرح کی قزاقی ہے، یہ کس نوع کا دماغی افلاس ہے، جو ایسی رکیک و سخیف ایسی دنی و ذلیل حرکات پر ہندوؤں کو آمادہ کئے ہوئے ہے۔ اگر مسلمانوں یا بہی خواہان اردو نے اس طرف توجہ نہ کی اور قوت مظاہرہ سے کام نہ لیا تو یہ طوفان کسی طرح نہیں رُک سکتا اور وہ وقت دور نہیں جب مسلمانوں کو پورے حقوق ہمسائیگی نہ دینے کے اسباب میں ایک قوی سبب یہ بھی بتایا جائے گا کہ اُن کی زبان میں اُردو و فارسی کے الفاظ شامل ہیں، ان کا سواد خط غیر ملکی ہے اور ان کی تحریر بجائے بائیں طرف کے داہنی طرف سے شروع کیجاتی ہے، جس کو ہندو قوم کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔

مجھے معلوم ہے کہ ہندو جماعت اس اظہار خیال پر بہت برہم ہوگی اور مجھے خود تکلیف ہے کہ میں کیوں ایسا لکھنے پر مجبور ہوا، لیکن اس باب میں اپنی طرف سے میں ایک عذر یہ ضرور پیش کر سکتا ہوں کہ

ازنالہ ام مرنج کہ آخر شدست کار
شمع خموشم و ز سرم دُود میرود

اخیر میں، نہایت ادب کے ساتھ میں اکاڈمی کے ارباب کار کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اردو زبان کی ترقی کے مسئلہ پر بالکل "غیر ہندو" ہو کر نگاہ ڈالیں اور اگر اُن کو اردو کے سمجھنے میں کسی قسم کی زحمت ہوتی ہے تو اس دلیل سے اس کے ناقص و ثقیل ہونے پر حکم نہ لگائیں، کیونکہ "جہل" کو علم کے جانچنے کا معیار مقرر کرنا قرین انصاف نہیں۔ اسی سلسلہ میں مجھے اڈیٹران رسالہ کی جماعت میں پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی سے یہ دریافت کرنا ہے کہ اُنھوں نے اس عقدۂ دشوار کے لئے "مشکلکشائی" کی کیا تدبیر سوچی ہے، یا وہ بھی اپنے دوسرے شریک ادارت پروفیسر صدیقی کی طرح (جن کی طرف سے تسمیۂ رسالہ کے سلسلہ میں تماہی کی تجویز پیش ہوئی تھی) اُسی "لاتحزن ان اللہ معنا" کا قائل ہونا پسند کرتے ہیں۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ اکاڈمی کی مجلس عاملہ کی دو نشستوں (۲۰ اگست سنہ ۳۰ء اور ۱۳ ستمبر سنہ ۳۰ء) کی کارروائی مجھے ملی اور اس کے ملاحظہ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ یہ بھی ایک مستقل گفتگو کی محتاج ہیں، لیکن چونکہ نہ اس ماہ کے ملاحظات میں اب گنجائش باقی ہے، نہ رسالہ میں کسی اور جگہ، اسلئے اس افسانہ کا دوسرا ٹکڑا ماہ آئندہ پر ملتوی کرتا ہوں۔

ماہ آیندہ دسویں سال کا پہلا پرچہ ہوگا اور حسب معمول زیادہ ضخامت لئے ہوئے نکلیگا۔ مینیجر نے جو اعلان صفحہ ۶ پر اس کے متعلق کیا ہے، اس میں مجھے صرف اسقدر اضافہ اور کرنا ہے کہ ممکن ہے مضامین کچھ اور بڑھ جائیں، اور اسطرح اسکی دلچسپی و افادہ کچھ اور زائد ہو جائے۔

احباب و ناظرین سے استدعا ہے کہ اگر وہ واقعی سال آیندہ نگار کی خریداری جاری رکھنا چاہتے ہیں تو مناسب صورت یہی ہے کہ وہ منی آرڈر کے ذریعہ سے چندہ روانہ فرمائیں اور نہ صرف اپنا بلکہ اپنے حلقۂ احباب میں سے کم از کم دو حضرات کا اور۔ کیا گزشتہ نو سال کی صحبت دیرینہ کا اسقدر حق بھی آپ پر نہیں ہے کہ نگار آپ سے یہ مطالبہ کرے اور آپ اس کو پورا کریں۔

نیاز


## کاجل۔ سُرمہ۔ چورن۔ منجن

(اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کرکے اپنی رائے انکے مفید ہونے کی بابت ظاہر کی ہے ملاحظات اکتوبر میں)

صرف یہ چار چیزیں میرے پاس ہیں۔ اور اگر آپ اعتبار کریں تو میں کہوں کہ انمیں سے ہر ایک چیز کو پچیس سال سے میرا خاندان تجربہ کر رہا ہے۔

**کاجل** جو آنکھوں کے تمام امراض کے لئے بیحد مفید ہے۔ سلائی لگاتے ہی ٹھنڈے سے نیند سی آنے لگتی ہے۔ جنکی آنکھیں آشوب کرتی رہتی ہیں۔ یا میلی ہو جاتی ہیں۔ یا سُرخی پیدا ہو جاتی ہے یا نزلہ کا پانی آتا رہتا ہے یا ضعف بصارت پیدا ہو چلا ہے۔ انکے لئے ہر روز رات کو ایک سلائی لگا لینا چند دن میں تمام شکایتیں دور کر دیتا ہے۔ ایک ڈبیہ جو ایک شخص کیلئے سال بھر کو کافی ہے قیمت عہ علاوہ محصول

**سُرمہ** یہ بیش بہا سُرمہ ۴۰ دن میں تیار ہوتا ہے۔ اسمیں نہ ممیرہ ہے، نہ کوئی جواہر بلکہ معمولی سرمہ ہے جسکو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیسکر طیار کیا جاتا ہے۔ اسکے فوائد کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ جالا، دھند، موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے۔ قیمت فی پڑیا (عمر) علاوہ محصول

**چورن** یہ وہ اکسیری چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد۔ قبض۔ نفخ۔ ریاح کا پیدا ہونا۔ سوء ہضم وسب یکلخت اسکے استعمال سے دور ہو جاتا ہے۔ کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو فوراً ایک چٹکی کھانیسے جاتا رہتا ہے قیمت فی ڈبہ ۸ تولہ عہ علاوہ محصول

**منجن**۔ اس کی ادنےٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ ۸ تولہ (عمر) علاوہ محصول۔

نوٹ۔ سب چیزیں منگانیوالوں کو محصول ڈاک معاف۔

م بیگم۔ نمبر ۲۴۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ،

## باجلاس جناب سردار احمد خانصاحب سول جج بہادر پشاور

دوکان موسومہ رام نرائن رام بیجناتھ دوکاندار صدر بازار کیمپ پشاور مدعی

بنام

محمد امیر مستری ملازم بجلی گھر ریلوے اسٹیشن سہارنپور مدعا علیہ

دعویٰ دلاپانے مبلغ ۔/۔ اصل وسود بروئے بہی کھاتہ

اشتہار زیر آرڈر نمبر ۵ رول نمبر ۲۰ ضابطہ دیوانی

مقدمہ مندرجہ بالا میں مدعا علیہ لتعمیل سمن سے گریز کرتا ہے۔ اور بروئے پیروی مقدمہ عدالت ہذا میں حاضر نہیں ہوتا۔ اس لئے بذریعہ اشتہار ہذا اُس کو اطلاع دیجاتی ہے کہ وہ مورخہ ۱۰ ار دسمبر سنہ ۳۴ء کو عدالت ہذا میں حاضر ہو کر پیروی مقدمہ کرے۔ ورنہ بصورت دیگر اُس کے برخلاف کارروائی یکطرفہ کی جاویگی۔ تحریر ۷ ر نومبر سنہ ۳۴ء

دستخط حاکم بخط انگریزی کنٹونمنٹ سول جج بہادر پشاور

مہر عدالت

---

آزمائیے اور

## صدہا مرتبہ کی آزمائی ہوئی دوائیں

خود آزمائیے

**تُرت پُھرت** مردانہ شرمناک مرضوں بچپن اور جوانی کی تمام غلط کاریوں اور اعصاب اور رگوں کی خرابیوں کو دور کرکے عمر بھر کے لئے ان قوتوں کو قائم رکھتا ہے جو سولہ سال کی عمر میں آپ کو حاصل تھیں۔ دو ہی مرتبہ کے استعمال میں کامل فائدہ کرتا ہے قیمت فی شیشی (عہ)

**جادو کی الائچی** بھوک بڑھاتی ہے۔ قوت مردمی کو چار چند کرتی۔ مردہ طاقتوں میں جان ڈالتی ہے۔ خون صالح پیدا کرکے رنگ کو گل انار بنادیتی ہے۔ قیمت کامل علاج۔ تین روپے چار آنے (للعہ)

**غازۂ یوسفی** چہرے کی چمک دمک رنگ و روپ کو اتنا بڑھاتا ہے کہ چار ہی دن میں کچھ اور ہو جاتا ہے۔ جھائیں۔ چھیپ۔ داغ وغیرہ کو بالکل دور کر دیتا ہے۔ قیمت فی شیشی دو روپے چار آنے (عہ)

**جوب اسرار شباب** مفصل لکھنا بدتہذیبی ہے۔ مگر عجیب چیز ہیں۔ ایک گولی نہ معلوم کیا کیا کرتی ہے۔ قیمت فی درجن تین روپے (سے)

### مینیجر دار الحکمت نیا گاؤں لکھنؤ

پرتاب ۱۲/
روہنی ۱۰/

**مولانا شرر مرحوم**

جنید بغدادی
ملکہ زنوبیہ ۳/
قرۃ العین ۳/
محذرات
جویائے حق
نعیت چین
فاتح مفتوح
بابک خرمی
الفانسو ۱۲/
ایام عرب
قیس ولبنیٰ
یوسف و نجمہ
زوال بغداد
مینا بازار
مقدس نازنین
رومتہ الکبریٰ
فلپانا
شوقین ملکہ
منصور موہنا
حسن انجلینا
ملک العزیز ورجنا ۱۲/
فردوس بریں
حسن کا ڈاکو
دربار حرام پور ۱۰/
غیب دان دلہن
بدر النساء کی مصیبت
سبوۂ تلخ

نیکی کا پھل

**شوق قدوائی**

ترانۂ شوق
قاسم و زہرہ
نیرنگ جمال

**میر ولی اللہ بی اے**

بندگی
کاس الکرام
لسان الغیب جلد اول
〃 دوم
〃 سوم
〃 چہارم
نمکدان فصاحت
بادۂ ناب

**ظفر عمر بی اے**

چوروں کا کلب ۹/
نیلی چھتری
بہرام کی گرفتاری

**مولانا نیاز فتحپوری**

گیتان جلی
گہوارۂ تمدن
نگارستان
صحابیات
تاریخ الدولتین

**سید سجاد حیدر بی اے**

زہرا
جلال الدین خوارزم شاہ
خیالستان
ثالث بالخیر

حکایات و احتساسات

**دلچسپ تاریخی جاسوسی ناول**

سراب فیشن
بالشویک شہزادی
شہید وفا
ممتاز بیگم ۱۲/
شعلۂ رنگین
محاصرۂ پیرس
شیخ چلی
بہادر ترک
بہرام کی واپسی
انقلاب فرانس
حسن بنارس
فطرتی جاسوس
ترکی حرم سرا
جنگ طرابلس
بہرام چور
زر پرست
کنجی کا راز
عبدالرحمن ناصر
عروس مصر
سیلاب خون
کرشمہ
وفادار دلہن
حواف زمین

سیاحت زمین
سیاحت ہوا
نازنین مراکش
سمندر کی سیر
اسرار بالشویزم
روح لیلیٰ
امین بگ
حجاج بن یوسف
یوسف پاشا
انقلاب عثمانی
بہرام کی رہائی
بہرام کی آزادی ۱۲/
بہرام کی سرگزشت
لال کتھور
پراسرار قتل

**ادبی کتابیں**

مکمل شرح دیوان غالب
بزم خیال
نشاط سخن
انشاء نسواں
مکاتیب محسن الملک
لیلیٰ مجنوں ڈراما

**مراثی**

مراثی دبیر
مراثی انیس
مراثی ضمیر

مراثی مونس
مراثی دلگیر

**تذکرۃ الشعراء**

تذکرۂ حسینی ۱۲/
گلشن ۱۰/
سراپائے سخن
سوانح نظیر اکبر آبادی

**دواوین فارسی**

دیوان شمس تبریز
کلیات عراقی ۱۲/
دیوان حافظ
دیوان نعمت خان عالی
کلیات انوری
دیوان بیدل
دیوان عرفی ۱۲/
کلیات جامی
کلیات غالب
کلیات صائب
کلیات حزیں
دیوان عنصری
دیوان ظہیر فاریابی
دیوان غنی کشمیری
دیوان ناصر علی
دیوان ہلالی
کلیات جلال اسیر
کلیات سعدی

**دواوین اردو**

دیوان حسن دہلوی
کلیات ظفر
کلیات مومن

دیوان ناسخ
کلیات میر
کلیات سودا
کلیات انشا
کلیات نظیر اکبرآبادی
گلزار داغ
دیوان رند ۹/
دیوان ذوق ۱۲/
کلیات اسمٰعیل
مرآۃ الغیب
مثنوی عشق
فریاد داغ
دیوان قاتل
دیوان شہیدی

**عجائب و غرائب**

عجائب المخلوقات تصویر رنگین
〃 بانصویر سادہ
مجمع الفنون
طلسم فرنگ
کارخانۂ عالم

**رینالڈ کے ناولوں کے ترجمے**

الہ دین ولیلیٰ
فریب حسن
سوزن عشق
روز ایمبرٹ
ناول اسرار
شام جوانی
طلسمی فانوس

# نگار بک ایجنسی
## نظیر آباد لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴


## شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس میں پاکیزگی بیان، اسلوب ادا، ندرت خیال، اور جدت اظہار کے ایسے ایسے نادر نمونے موجود ہیں کہ کسی ادبی تصنیف میں نہیں مل سکتے۔ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔

قیمت علاوہ محصول دس آنے ۱۰؍

## صحابیات

جس میں عہد سعادت کی ۵۸ خواتین کے مستند حالات یکجا کردیئے گئے ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص اپنی انشا میں اسقدر جوش و قوت کے ساتھ لکھا ہے کہ مسئلہ نسائیت کے بہت سے نکات اس سے حل ہو جاتے ہیں

قیمت علاوہ محصول ۶؍

## شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشا، عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے

قیمت علاوہ محصول عہ؍

## جذبات بھاشا

ہندی شاعری کی حلاوت و شیرینی تمام شاعری میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی نظیر و تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے

قیمت علاوہ محصول بارہ آنے (۱۲؍)

## تاریخ الدولتین

مصر کے مشہور مورخ کی تاریخ جرجی زیدان کے ایک حصہ کا ترجمہ جس میں تمدن اسلامی کی سیاسی تاریخ پر عہد امیہ و بنی عباس کی سیاسی تاریخ پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ مولانا نیاز نے کیا ہے اور اسقدر سادگی و تسلسل کے ساتھ کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔

قیمت علاوہ محصول عہ؍

## فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح طور سے پیشین گوئی کرسکتا ہے

قیمت علاوہ محصول عہ؍

## تذکرہ خندۂ گل

مولفہ مولوی عبدالباری آسی جس میں ۳۰۰ سے زائد اردو و فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں اردو میں اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے۔

حجم ۵۰۰ صفحات

قیمت مع محصول چار روپیہ (للعہ؍)

## گہوارۂ تمدن

(دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جسمیں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا ئے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۳؍

## نگارستان

(دوسرا اڈیشن) زیر طبع ہے جسمیں حضرت نیاز کے اور متعدد ادبی مضامین و افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت بعد طباعت تعین کیجائے گی

مینجر رسالہ "نگار" نظیر آباد لکھنؤ

हिन्दुस्तानी एकेडेमी, पुस्तकालय
इलाहाबाद

वर्ग संख्या..........................................

पुस्तक संख्या......................................

क्रम संख्या.............३२८५..............